میں نے اپنے ارادہ کو ترک کر دیا۔

ظاہر ہے کہ بیت اللہ کی تعمیر کو بناءِ ابراہیمی کے مطابق بنانا ایک طاعت اور کارِ ثواب تھا، مگر اس پر لوگوں کی ناواقفیت کے سبب ایک خطرہ کا ترتب دیکھ کر آپ نے اس ارادہ کو ترک فرما دیا۔ اس واقعہ سے بھی یہی اصول مستفاد ہوا کہ اگر کسی جائز بلکہ ثواب کے کام پر کوئی مفسدہ لازم آتا ہو تو وہ جائز کام بھی ممنوع ہو جاتا ہے۔

لیکن اس پر ایک قوی اشکال ہے، جس کو رُوح المعانی میں ابو منصور سے نقل کیا ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر جہاد و قتال لازم فرمایا ہے، حالانکہ قتال کا یہ لازمی نتیجہ ہو کہ مسلمان کسی غیر مسلم کو قتل کرنے کا ارادہ کرے گا تو وہ مسلمانوں کو قتل کریں گے، اور مسلمان کا قتل حرام ہے، تو اس اصول پر جہاد بھی ممنوع ہو جانا چاہئے، ایسے ہی ہماری تبلیغ اسلام اور تلاوتِ قرآن پر نیز اذان اور نماز پر بہت سے کفار مذاق اڑاتے اور مضحکہ بناتے ہیں، تو کیا ہم ان کے اس غلط روّیہ کی بناء پر اپنی عبادات سے دستبردار ہو جائیں گے۔

اس کا جواب خود ابو منصور نے یہ دیا ہے کہ یہ اشکال ایک ضروری شرط کے نظر انداز کر دینے سے پیدا ہو گیا ہے، شرط یہ ہے کہ وہ جائز کام جس کو لزومِ مفسدہ کی وجہ سے منع کر دیا گیا ہے اسلام کے مقاصد اور ضروری کاموں میں سے نہ ہو، جیسے معبوداتِ باطلہ کو بُرا کہنا، اس سے اسلام کا کوئی مقصد متعلق نہیں، اسی طرح بیت اللہ کی تعمیر کو بناءِ ابراہیمی کے مطابق بنانا اس پر بھی کوئی اسلامی مقصد موقوف نہیں، اس لئے جب اس پر کسی دینی مفسدہ کا خطرہ لاحق ہوا تو ان کاموں کو ترک کر دیا گیا، اور جو کام ایسے ہیں کہ اسلام میں خود مقصود ہیں، یا کوئی مقصد اسلامی اس پر موقوف ہے اگر دوسرے لوگوں کی غلط روی سے ان پر کوئی مفسدہ اور خرابی مرتب بھی ہوتی نظر آئے تو ان مقاصد کو ہرگز ترک نہ کیا جائے گا، بلکہ اس کی کوشش کی جائے گی کہ یہ کام تو اپنی جگہ جاری رہیں اور پیش آنے والے مفاسد جہاں تک ممکن ہو بند ہو جائیں، یہی وجہ ہو کہ ایک مرتبہ حضرت حسن بصریؒ اور امام محمد بن سیرینؒ دونوں حضرات ایک جنازہ کی نماز میں شرکت کے لئے چلے، وہاں دیکھا کہ مردوں کے ساتھ عورتوں کا بھی اجتماع ہے، اس کو دیکھ کر ابن سیرینؒ واپس ہو گئے، مگر حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ لوگوں کی غلط روش کی وجہ سے ہم اپنے ضروری کام کیسے چھوڑ دیں، نمازِ جنازہ فرض ہے اس کو اس مفسدہ کی وجہ سے ترک نہیں کیا جا سکتا، ہاں اس کی کوشش تابمقدور کی جائے گی کہ یہ مفسدہ مٹ جائے۔

یہ واقعہ بھی رُوح المعانی میں نقل کیا گیا ہے۔

اس لئے خلاصہ اس اصول کا جو آیتِ مذکورہ سے نکلا ہے یہ ہو گیا کہ جو کام اپنی ذات میں جائز بلکہ طاعت و ثواب بھی ہو مگر مقاصدِ شرعیہ میں سے نہ ہو، اگر اس کے کرنے پر کچھ مفاسد لازم آ جائیں تو وہ کام ترک کر دینا واجب ہو جاتا ہے، بخلاف مقاصدِ شرعیہ کے کہ وہ لزومِ مفاسد کی وجہ سے ترک نہیں کئے جا سکتے۔

اس اصول سے فقہاءِ امت نے ہزاروں مسائل کے احکام نکالے ہیں، فقہاء نے فرمایا کہ کسی شخص کا بیٹا نافرمان ہو اور وہ یہ جانتا ہو کہ اس کو کسی کام کے کرنے کے لئے کہوں گا تو انکار کرے گا اور اس کے خلاف کرے گا جس سے اس کا سخت گناہگار ہونا لازم آئے گا تو ایسی صورت میں باپ کو چاہئے کہ اس کو حکم کے انداز میں کسی کام کے کرنے یا چھوڑنے کو نہ کہے، بلکہ نصیحت کے انداز میں اس طرح کہے کہ فلاں کام کر لیا جائے تو بہت اچھا ہو، تاکہ انکار یا خلاف کرنے کی صورت میں ایک جدید نافرمانی کا گناہ اس پر عائد نہ ہو جائے (خلاصۃ الفتاویٰ)۔

اسی طرح کسی کو وعظ و نصیحت کرنے میں بھی اگر قرائن سے یہ معلوم ہو جائے کہ وہ نصیحت قبول کرنے کے بجائے کوئی ایسا غلط انداز اختیار کرے گا جس کے نتیجہ میں وہ اور زیادہ گناہ میں مبتلا ہو جائے گا تو ایسی صورت میں نصیحت ترک کر دینا بہتر ہے، امام بخاریؒ نے صحیح بخاریؒ میں اس موضوع پر ایک مستقل باب رکھا ہے باب من ترک بعض الاختیار مخافۃ ان یقصر فھم بعض الناس فیقعوا فی اشد منہ، یعنی بعض اوقات جائز بلکہ مستحسن چیزوں کو اس لئے چھوڑ دیا جاتا ہے کہ اس سے کم فہم عوام کو کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے، بشرطیکہ یہ کام مقاصدِ اسلامیہ میں داخل نہ ہو۔

مگر جو کام مقاصدِ اسلامیہ میں داخل ہیں خواہ فرائض و واجبات ہوں یا سنن مؤکدہ یا دوسری قسم کے شعائرِ اسلامی، اگر ان کے ادا کرنے سے کچھ کم فہم لوگ غلطی میں مبتلا ہونے لگیں تو ان کاموں کو ہرگز نہ چھوڑا جائے گا، بلکہ دوسرے طریقوں سے لوگوں کی غلط فہمی اور غلط کاری کو دور کرنے کی کوشش کی جائے گی، ابتداءِ اسلام کے واقعات شاہد ہیں کہ نماز و تلاوت اور تبلیغ اسلام کی وجہ سے مشرکینِ مکہ کو اشتعال ہوتا تھا .... مگر اس کی وجہ سے ان شعائرِ اسلام کو کبھی ترک نہیں کیا گیا، بلکہ خود آیتِ مذکورہ کے شانِ نزول میں جو واقعہ ابو جہل وغیرہ رؤساءِ قریش کا ذکر کیا گیا ہے اس کا حاصل یہی تھا کہ قریشی سردار اس پر صلح کرنا چاہتے تھے کہ آپ توحید کی تبلیغ کرنا چھوڑ دیں، جس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ میں یہ کام کسی حال میں نہیں کر سکتا اگرچہ وہ آفتاب و ماہتاب لا کر میرے ہاتھ پر رکھ دیں۔

اس لئے اس مسئلہ کی تنقیح اس طرح ہو گئی کہ جو کام مقاصد اسلامیہ میں داخل ہیں اگر ان کے کرنے سے کچھ لوگ غلط فہمی یا غلط کاری کا شکار ہوتے ہوں تو ان کاموں کو ہرگز نہ چھوڑا جائے گا، ہاں جو کام مقاصد اسلامیہ میں داخل نہیں، اور ان کے ترک کر دینے سے کوئی دینی مقصد فوت نہیں ہوتا ایسے کاموں کو دوسروں کی غلط فہمی یا غلط کاری کے اندیشہ کی وجہ سے چھوڑ دیا جائیگا۔

پچھلی آیات میں اس کا ذکر تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کھلے ہوئے معجزات اور اللہ تعالیٰ کی روشن نشانیوں کے باوجود ہٹ دھرم لوگوں نے ان سے فائدہ نہ اٹھایا، اپنے انکار اور ضد پر جمے رہے، اگلی آیات میں اس کا ذکر ہے کہ ان لوگوں نے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کا ایک نیا روپ یہ بدلا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خاص خاص قسم کے معجزات دکھلانے کا مطالبہ کیا، جیسا کہ ابن جریرؒ نے نقل کیا ہے کہ قریشی سرداروں نے مطالبہ کیا کہ اگر آپ ہمیں یہ معجزہ دکھلا دیں کہ کوہ صفا پورا سونا ہو جائے تو ہم آپ کی نبوت و رسالت کو مان لیں گے، اور مسلمان ہو جائیں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اچھا معاہدہ کرو کہ اگر یہ معجزہ ظاہر ہو گیا تو تم سب مسلمان ہو جاؤ گے، انھوں نے قسمیں کھالیں، آپؐ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے کے لئے کھڑے ہو گئے کہ اس پہاڑ کو سونا بنا دیجئے، حضرت جبرئیل علیہ السلام وحی لے کر آئے کہ اگر آپ چاہیں تو ہم ابھی اس پورے پہاڑ کو سونا بنا دیں، لیکن قانونِ الٰہی کے مطابق اس کا نتیجہ ہوگا کہ اگر پھر بھی یہ ایمان نہ لائے تو سب پر عذاب عام نازل کر کے ہلاک کر دیا جائے گا جیسے پچھلی قوموں میں ہمیشہ ہوتا رہا ہے، کہ انھوں نے کسی خاص معجزہ کا مطالبہ کیا، وہ دکھایا گیا، اور وہ پھر بھی منکر ہو گئے، تو ان پر خدا تعالیٰ کا قہر و عذاب نازل ہو گیا، رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ ان لوگوں کی عادات اور ہٹ دھرمی سے واقف تھے بمقتضائے شفقت آپؐ نے فرمایا کہ اب میں اس معجزہ کی دعا نہیں کرتا، اس واقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی، وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ، جس میں کفار کے قول کی نقل کی ہے، کہ انھوں نے مطلوبہ معجزہ ظاہر ہونے پر مسلمان ہو جانے کے لئے قسمیں کھالیں، اس کے بعد کی آیت اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ میں ان کے قول کا جواب ہے کہ معجزات اور نشانیاں سب اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں، اور جو معجزات ظاہر ہو چکے ہیں وہ بھی اسی کی طرف سے تھے، اور جن کا مطالبہ کیا جا رہا ہے ان پر بھی وہ پوری طرح قادر ہے، لیکن از روئے عقل و انصاف ان کو ایسا مطالبہ کرنے کا کوئی حق نہیں، کیونکہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہونے کے مدعی ہیں، اور اس دعوے پر بہت سے دلائل اور شہادتیں معجزات کی صورت میں پیش فرما چکے ہیں، اب

دوسرے فریق کو اس کا تو حق ہے کہ ان دلائل اور شہادتوں پر جرح کرے ان کو غلط ثابت کرے، لیکن ان پیش کردہ شہادتوں میں کوئی جرح نہ کریں اور پھر یہ مطالبہ کریں کہ ہم تو دوسری شہادتیں چاہتے ہیں، یہ ایسا ہوگا جیسا عدالت میں کوئی مدعا علیہ مدعی کے پیش کردہ گواہوں پر تو کوئی جرح نہ کرے، مگر یہ کہے کہ میں تو ان گواہوں کی شہادت نہیں مانتا، بلکہ فلاں معین شخص کی گواہی پر بات مانوں گا، اس کو کوئی عدالت قابل سماعت نہ سمجھے گی۔

اسی طرح نبوت و رسالت پر بے شمار آیات بینات اور معجزات ظاہر ہو جانے کے بعد جب تک ان معجزات کو غلط ثابت نہ کریں ان کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ ہم تو فلاں قسم کا معجزہ دیکھیں گے جب ایمان لائیں گے۔

اس کے بعد آخر آیات تک مسلمانوں کو فہمائش اور خطاب ہے کہ تمہارا کام دینِ حق پر خود قائم رہنا اور دوسروں کو صحیح طریقہ سے پہنچا دینا ہے، پھر بھی اگر وہ ہٹ دھرمی کرنے لگیں تو ان کی فکر میں پڑنا نہیں چاہئے، کیونکہ زبردستی کسی کو مسلمان بنانا نہیں، اگر زبردستی بنانا ہوتا تو اللہ تعالیٰ سے زیادہ زبردست کون ہے، وہ خود ہی سب کو مسلمان بنا دیتے، اور ان آیات میں مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لئے یہ بھی بتلا دیا گیا کہ اگر ہم ان کے مانگے ہوئے معجزات کو بھی بالکل کھلے اور واضح طور پر ظاہر کر دیں یہ جب بھی ایمان نہ لائیں گے، کیونکہ ان کا انکار کسی غلط فہمی یا ناواقفیت کی وجہ سے نہیں، بلکہ ضد اور عناد اور ہٹ دھرمی سے ہے، جس کا علاج کسی معجزہ سے نہیں ہوا کرتا، آخری آیت وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ میں اسی مضمون کا بیان ہے کہ اگر ہم اُن کو ان کے فرمائشی معجزات سب دکھلا دیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ فرشتوں سے ان کی ملاقات اور مُردوں سے گفتگو کرا دیں، جب بھی وہ ماننے والے نہیں، بعد کی دو آیتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ یہ لوگ اگر آپؐ سے عداوت کرتے ہیں تو کچھ تعجب کی بات نہیں، پچھلے تمام انبیاء کے بھی دشمن ہوتے چلے آئے ہیں، آپ اس سے دلگیر نہ ہوں۔

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ
سو کیا اب اللہ کے سوا کسی اور کو منصف بناؤں حالانکہ اسی نے اتاری تم پر کتاب
مُفَصَّلًا ۭ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ
واضح اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ نازل ہوئی ہے
مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۱۱۴ وَتَمَّتْ
تیرے رب کی طرف سے ٹھیک سو تو مت ہو شک کرنے والوں میں سے اور تیرے رب کی

كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ

بات پوری سچی ہے اور انصاف کی، کوئی بدلنے والا نہیں اس کی بات کو اور وہی سننے والا

الْعَلِيْمُ ﴿۱۱۵﴾ وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ

جاننے والا اور اگر تو کہنا مانے گا اکثر ان لوگوں کا جو دنیا میں ہیں تو تجھ کو بہکا دیں گے اللہ کی

سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۱۱۶﴾

راہ سے وہ سب تو چلتے ہیں اپنے خیال پر اور سب اٹکل ہی دوڑاتے ہیں،

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ يَّضِلُّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ

تیرا رب خوب جاننے والا ہے اس کو جو بہکتا ہے اس کی راہ سے اور وہی خوب جانتا ہے

بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۱۷﴾

ان کو جو اس کی راہ پر ہیں

خلاصۂ تفسیر

(آپ کہہ دیجئے کہ میرے تمہارے درمیان جو مقدمۂ رسالت میں اختلاف ہے کہ میں بحکم سرکاری اس کا مدعی ہوں اور تم منکر اور یہ مقدمہ اجلاس احکم الحاکمین سے میرے حق میں اس طرح طے اور فیصل ہو چکا ہے کہ میرے اس دعوے پر کافی ثبوت اور دلیل، یعنی قرآن معجز خود قائم فرما دیا ہے اور تم پھر بھی نہیں مانتے) تو کیا (تم یہ چاہتے ہو کہ اس خدائی فیصلہ کو کافی نہ قرار دوں اور) اللہ کے سوا کسی اور فیصلہ کرنے والے کو تلاش کروں، حالانکہ وہ ایسا (کامل فیصلہ کر چکا) ہے کہ اس نے ایک کتاب (جو اپنے اعجاز میں) کامل (ہے) تمہارے پاس بھیج دی ہے (جو اپنے اعجاز کی وجہ سے دلالۃ علی النبوۃ میں کافی ہے، پس اس کے دو کمال تو یہ ہیں، اعجاز و تنزیل من اللہ، اور اس کے علاوہ اور وجوہ سے بھی کامل، اور اس سے جو اور مقاصد ہدایت و تعلیم کے متعلق ہیں ان کے لئے کافی ہے چنانچہ) اس کی (ایک یعنی تیسری) حالت (کمال کی) یہ ہے کہ اس کے مضامین (جو دین کے باب میں اہم ہیں) خوب صاف صاف بیان کئے گئے ہیں اور (چوتھا وصف کمال اس کا یہ ہے کہ کتب سابقہ میں اس کی خبر دی گئی تھی جو علامت ہے اس کے مہتم بالشان ہونے کی چنانچہ) جن لوگوں کو ہم نے کتاب (یعنی توراۃ و انجیل) دی ہے وہ اس کو یقین کے ساتھ جانتے ہیں کہ یہ (قرآن) آپ کے رب کی طرف سے واقعیت کے ساتھ بھیجا گیا ہے (اس کو جانتے تو سب ہیں، پھر جن میں حق گوئی

کی صفت تھی، انھوں نے ظاہر بھی کر دیا، اور جو معاند تھے وہ ظاہر نہ کرتے تھے) سو آپ شبہ کرنے والوں میں نہ ہوں اور (پانچواں وصف کمال اس کا یہ ہو کہ) آپ کے رب کا (یہ) کلام واقعیت اور اعتدال کے اعتبار سے (بھی) کامل ہے (یعنی علوم و عقائد میں واقعیت اور اعمال ظاہری اور باطنی میں اعتدال لئے ہوئے ہے، اور چھٹا وصف کمال اس کا یہ ہو کہ اس کے (اس) کلام کا کوئی بدلنے والا نہیں (یعنی کسی کی تحریف و تغییر سے اس کا اللہ محافظ ہے وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ) اور (ایسی کامل دلیل پر بھی جو لوگ تکذیب قلبی و زبانی سے پیش آویں) وہ (یعنی اللہ تعالیٰ ان کے اقوال کو) خوب سن رہے ہیں (اور ان کے عقائد کو) خوب جان رہے ہیں، (اپنے وقت پر ان کو کافی سزا دیں گے) اور (باوجود وضوح دلائل کے) دنیا میں زیادہ لوگ ایسے (منکر اور گمراہ ہی) ہیں کہ اگر (بالفرض) آپ ان کا کہنا ماننے لگیں تو وہ آپ کو اللہ کی راہ (راست) سے بے راہ کر دیں (کیونکہ وہ خود گمراہ ہیں چنانچہ عقائد میں) وہ محض بے اصل خیالات پر چلتے ہیں اور (اقوال میں) بالکل قیاسی باتیں کرتے ہیں (اور ان کے مقابلہ میں بعضے بندگان خدا راہ پر بھی ہیں اور) بالیقین آپ کا رب ان کو (بھی) خوب جانتا ہے جو اس کی (بتلائی ہوئی) راہ (راست) سے بے راہ ہو جاتا ہے اور وہ (ہی) ان کو بھی خوب جانتا ہے جو اس کی (بتلائی ہوئی) راہ پر چلتے ہیں (پس گمراہوں کو سزا ملے گی راہ والوں کا انعام و اکرام ہوگا)۔

معارف و مسائل

پچھلی آیات میں اس کا ذکر تھا کہ مشرکین مکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے حق و صحیح ہونے پر کھلے کھلے معجزات اور دلائل دیکھنے اور جاننے کے باوجود ہٹ دھرمی سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ فلاں فلاں قسم کے خاص معجزات ہمیں دکھلائے جائیں تو ہم ماننے کو تیار ہیں، قرآن کریم نے ان کی کج بحثی کا یہ جواب دیا کہ جو معجزات یہ اب دیکھنا چاہتے ہیں ہمارے لئے ان کا ظاہر کرنا بھی کچھ مشکل نہیں، لیکن یہ ہٹ دھرم لوگ ان کو دیکھنے کے بعد بھی سرکشی سے باز نہ آئیں گے، اور قانونِ قدرت کے ماتحت اس کا نتیجہ پھر یہ ہوگا کہ ان سب پر عذاب آجائے گا۔

اسی لئے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے مانگے ہوئے معجزات کے ظاہر کرنے سے شفقت کی بنا پر انکار کر دیا، اور جو معجزات و دلائل اب تک اُن کے سامنے آچکے ہیں انہی میں غور کرنے کی طرف ان کو دعوت دی، مذکورہ آیات میں اُن دلائل کا بیان ہے جن سے بدیہی طور پر قرآن کریم کا حق اور کلام الٰہی ہونا ثابت ہے۔

پہلی آیت میں جو ارشاد فرمایا اس کا حاصل یہ ہے کہ میرے اور تمہارے درمیان مقدمہ رسالت و نبوت میں اختلاف ہے، میں اس کا مدعی ہوں اور تم منکر، اور یہ مقدمہ احکم الحاکمین کے اجلاس سے میرے حق میں اس طرح طے اور فیصل ہو چکا ہے کہ میرے اس دعوے پر کافی ثبوت اور دلیل خود قرآن کا اعجاز ہے، جس نے تمام اقوام عالم کو چیلنج کیا کہ اگر اس کے کلام الٰہی ہونے میں کسی کو شبہ ہو تو اس کلام کی ایک چھوٹی سی سورت یا آیت کا مقابلہ کر کے دکھلاؤ جس کے جواب میں تمام عرب عاجز رہا، اور وہ لوگ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کو پست کرنے کے لئے اپنی جان، مال، اولاد، آبرو سب کچھ قربان کر رہے تھے ان میں سے ایک بھی ایسا نہ نکلا کہ قرآن کے مقابلہ کے لئے ایک دو آیت بنا کر پیش کر دیتا، یہ کھلا ہوا معجزہ کیا قبول حق کے لئے کافی نہ تھا کہ ایک امی جس نے کہیں کسی سے تعلیم نہیں پائی اس کے پیش کئے ہوئے کلام کے مقابلہ سے پورا عرب بلکہ پورا جہان عاجز ہو جائے، یہ درحقیقت احکم الحاکمین کی عدالت سے اس مقدمہ کا واضح فیصلہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول برحق اور قرآن اللہ جل شانہ کا کلام ہے۔

پہلی آیت میں اسی کے متعلق فرمایا أَفَغَيْرَ اللَّهِ أَبْتَغِي حَكَمًا، یعنی کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ کے بعد میں کسی اور فیصلہ کرنے والے کو تلاش کروں، یہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد قرآن کریم کی چند ایسی خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے جو خود قرآن کریم کے حق اور کلام الٰہی ہونے کا ثبوت ہیں، مثلاً فرمایا: هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا، جس میں قرآن کریم کے چار خصوصی کمالات کا بیان ہے، اول یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیا ہوا ہے، دوسرے یہ کہ وہ ایک کتاب کامل اور معجز ہے کہ سارا جہان اس کے مقابلہ سے عاجز ہے، تیسرے یہ کہ تمام اہم اور اصولی مضامین اس میں بہت مفصل واضح بیان کئے گئے ہیں، چوتھے یہ کہ قرآن کریم سے پہلے اہل کتاب یہود و نصاریٰ بھی یقین کے ساتھ جانتے ہیں کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیا ہوا کلام حق ہے، پھر جن میں کوئی سچائی اور حق گوئی کی صفت تھی، انھوں نے اس کو ظاہر بھی کر دیا، اور جو لوگ معاند تھے وہ باوجود یقین کے اس کا اظہار نہ کرتے تھے۔

قرآن کریم کی ان چار صفات کو بیان کرنے کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے، فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ، یعنی ان واضح دلائل کے بعد آپ شبہ کرنے والوں میں نہ ہوں، یہ ظاہر ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو کسی وقت بھی شبہ کرنے والوں میں نہ تھے نہ ہو سکتے تھے، جیسا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ نہ میں نے کبھی شک کیا، اور نہ کبھی سوال کیا، معلوم ہوا کہ یہاں اگرچہ لفظوں میں خطاب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے، لیکن درحقیقت سنانا دوسروں کو مقصود ہے اور آپ کی طرف اسناد کرنے سے مبالغہ اور تاکید کرنا منظور ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا کہا گیا تو دوسروں کی کیا ہستی ہے جو کوئی شک کر سکیں۔

دوسری آیت میں قرآن حکیم کی اور دو امتیازی صفات کا بیان ہے جو قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا کافی ثبوت ہیں، ارشاد ہے وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ، یعنی کامل ہے کلام آپ کے رب کا سچائی اور انصاف اور اعتدال کے اعتبار سے اس کے کلام کو کوئی بدلنے والا نہیں۔

لفظ تَمَّتْ میں کامل ہونے کا بیان ہے، اور كَلِمَتُ رَبِّكَ سے مراد قرآن ہے (بحر محیط عن قتادہؒ) قرآن کے کل مضامین دو قسم کے ہیں، ایک وہ جن میں تاریخ عالم کے عبرت آموز واقعات و حالات اور نیک اعمال پر وعدہ اور بُرے اعمال پر سزا کی وعید بیان کی گئی ہے، دوسرے وہ جن میں انسان کی صلاح و فلاح کے لئے احکام بیان کئے گئے ہیں، ان دونوں قسموں کے متعلق قرآن مجید کی یہ دو صفتیں بیان فرمائیں، صِدْقًا وَعَدْلًا، صدق کا تعلق پہلی قسم سے ہے، یعنی جتنے واقعات و حالات یا وعدہ وعید قرآن میں بیان کئے گئے ہیں وہ سب سچے اور صحیح ہیں، ان میں کسی غلطی کا امکان نہیں، اور عدل کا تعلق دوسری قسم یعنی احکام سے ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کے تمام احکام عدل پر مبنی ہیں، اور لفظ عدل کا مفہوم دو معنی کو شامل ہے، ایک انصاف جس میں کسی پر ظلم اور حق تلفی نہ ہو، دوسرے اعتدال کہ نہ بالکل انسان کی نفسانی خواہشات کے تابع ہوں، اور نہ ایسے جن کو انسانی جذبات اور اس کے فطری ملکات برداشت نہ کر سکیں، جس کا مطلب یہ ہوا کہ تمام احکام الٰہیہ انصاف اور اعتدال پر مبنی ہیں نہ ان میں کسی پر ظلم ہے اور نہ ان میں ایسی شدت اور تکلیف ہے جس کو انسان برداشت نہ کر سکے، جیسے دوسری جگہ ارشاد ہے: لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا، یعنی اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی وسعت و طاقت سے زیادہ کسی عمل کی تکلیف نہیں دیتے" اس کے ساتھ ہی اس آیت میں لفظ تَمَّتْ لا کر یہ بھی بتلا دیا کہ صرف یہی نہیں کہ قرآن کریم میں ...... صدق و عدل کی صفات موجود ہیں، بلکہ وہ ان صفات میں ہر حیثیت سے کامل و مکمل ہے۔

اور یہ بات کہ تمام قرآنی احکام تمام اقوام دنیا کے لئے اور قیامت تک آنیوالی نسلوں اور بدلنے والے حالات کے لئے انصاف پر بھی مبنی ہوں اور اعتدال پر بھی، یہ اگر

ذرا بھی غور کیا جائے تو صرف احکامِ خداوندی ہی میں ہو سکتا ہے، دنیا کی کوئی قانون ساز اسمبلی تمام موجودہ اور آئندہ پیش آنے والے حالات کا نہ پورا اندازہ لگا سکتی ہے، اور نہ اُن سب حالات کی رعایت کر کے کوئی قانون بنا سکتی ہے، ہر ملک و قوم اپنے ملک اور اپنی قوم کے بھی صرف موجودہ حالات کے پیشِ نظر قانون بناتی ہے، اور ان قوانین میں بھی تجربہ کرنے کے بعد بہت سی چیزیں عدل و اعتدال کے خلاف محسوس ہوتی ہیں، تو ان کو بدلنا پڑتا ہے، دوسری قوموں اور دوسرے ملکوں یا آئندہ حالات کی پوری رعایت کر کے ایسا قانون وضع کرنا جو ہر قوم ہر ملک ہر حال میں عدل و اعتدال کی صفات لئے ہوئے ہو یہ انسانی فکر و نظر سے بالاتر ہے، صرف حق جل وعلا شانہٗ کے ہی کلام میں ہو سکتا ہے، اس لئے یہ پانچویں صفت قرآن کریم کی کہ اس میں بیان کئے ہوئے گذشتہ اور آئندہ کے تمام واقعات اور وعدہ وعید سب سچے ہیں، ان میں خلاف واقع ہونے کا ادنیٰ شبہ نہیں ہو سکتا، اور اس کے بیان کئے ہوئے تمام احکام پوری دنیا اور قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے عدل و اعتدال لئے ہوئے ہیں، نہ ان میں کسی پر ظلم ہے، نہ اعتدال و میانہ روی سے سرِ مو تجاوز ہے، یہ بجائے خود قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کا مکمل ثبوت ہے۔

چھٹی صفت یہ بیان فرمائی کہ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ، یعنی اللہ تعالیٰ کے کلمات کو کوئی بدلنے والا نہیں، بدلنے کی ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ کوئی اس میں غلطی ثابت کرے، اس لئے بدلا جائے، یا یہ کہ کوئی دشمن زبردستی اس کو بدل ڈالے، اللہ تعالیٰ کا کلام ان سب چیزوں سے بالاتر اور پاک ہے، اس نے خود وعدہ فرمایا ہے کہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ، یعنی ہم نے ہی قرآن کو نازل کیا ہے، اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں، پھر کس کی مجال ہے کہ خدا کی حفاظت کو توڑ کر اس میں کوئی تغیر تبدل کر سکے، چنانچہ چودہ سو برس اس پر گذر چکے ہیں، اور ہر قرن ہر زمانہ میں قرآن کے مخالف اس کے ماننے والوں کی نسبت تعداد میں بھی زیادہ رہے ہیں، قوت میں بھی، مگر کسی کی مجال نہیں ہو سکی کہ قرآن کے ایک زبر زیر میں فرق پیدا کر سکے، ہاں بدلنے کی ایک تیسری صورت یہ بھی ہو سکتی تھی کہ خود حق تعالیٰ کی طرف سے اس کو منسوخ کر کے بدل دیا جائے، اسی لئے حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ اس آیت میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آخری پیغمبر اور قرآن آخری کتاب ہے، اس کے بعد نسخ کا کوئی احتمال نہیں، جیسا کہ قرآن کریم کی دوسری آیات میں یہ مضمون اور بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ آیا ہے۔

آخر آیت میں فرمایا وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ، یعنی اللہ جل شانہٗ اس تمام گفت کو کو

سنتے ہیں جو یہ لوگ کر رہے ہیں، اور سب کے حالات اور اسرار سے واقف ہیں ہر ایک کے عمل کا بدلہ اس کے مطابق دیں گے۔

تیسری آیت میں حق تعالیٰ نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی کہ زمین پر بسنے والے بنی آدم کی اکثریت گمراہی پر ہے، آپ اس سے مرعوب نہ ہوں ان کی باتوں پر کان نہ دھریں قرآن نے متعدد مقامات پر اس مضمون کو بیان فرمایا ہے، ایک جگہ ارشاد ہے وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ اَكْثَرُ الْاَوَّلِيْنَ، دوسری جگہ ارشاد ہے وَمَا اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ، مطلب یہ ہے کہ عادۃً انسان پر عددی اکثریت کا رعب غالب ہو جاتا ہے، اور ان کی اطاعت کرنے لگتا ہے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کیا گیا کہ:-

"دنیا میں زیادہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر آپ ان کا کہنا ماننے لگیں تو وہ آپ کو اللہ کی راہ سے بے راہ کر دیں، کیونکہ وہ عقائد و نظریات میں محض خیالات اور اوہام کے پیچھے چلتے ہیں اور احکام میں محض تخمینہ اور اٹکل سے کام لیتے ہیں، جن کی کوئی بنیاد نہیں"

خلاصہ یہ ہے کہ آپ ان کی عددی اکثریت سے مرعوب ہو کر ان کی موافقت کا خیال بھی نہ فرما دیں، کیونکہ یہ سب بے اصول اور بے راہ چلنے والے ہیں، آخر آیت میں فرمایا کہ:

"بالیقین آپ کا رب ان کو خوب جانتا ہے، جو اس کی راہ سے بے راہ ہو جاتا ہے اور وہ اس کو بھی خوب جانتا ہے جو اس کی راہ پر چلتا ہے، پس جیسے گمراہوں کو سزا ملے گی، سیدھی راہ والوں کو انعام و اکرام حاصل ہوگا۔

فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۸﴾

سو تم کھاؤ اس جانور میں سے جس پر نام لیا گیا ہے اللہ کا اگر تم کو اس کے حکموں پر ایمان ہے،

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ

اور کیا سبب کہ تم نہیں کھاتے اس جانور میں سے کہ جس پر نام لیا گیا ہے اللہ کا اور وہ واضح کر چکا

لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ وَاِنَّ

تم کو جو کچھ اس نے تم پر حرام کیا ہے مگر جب کہ مجبور ہو جاؤ اس کے کھانے پر اور بہت لوگ

كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ اِنَّ رَبَّكَ

بہکاتے پھرتے ہیں اپنے خیالات پر بغیر تحقیق، تیرا رب ہی

هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ ؕ

خوب جانتا ہے حد سے بڑھنے والوں کو اور چھوڑ دو کھلا ہوا گناہ اور چھپا ہوا

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۲۰﴾

جو لوگ گناہ کرتے ہیں عنقریب سزا پاویں گے اپنے کیے کی ،

وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ

اور اس میں سے نہ کھاؤ جس پر نام نہیں لیا گیا اللہ کا اور یہ کھانا گناہ ہے ،

وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَاِنْ

اور شیطان دل میں ڈالتے ہیں اپنے رفیقوں کے تاکہ وہ تم سے جھگڑا کریں اور اگر ع ۱۴ ۱

اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

تم نے ان کا کہا مانا تو تم بھی مشرک ہوئے

ربطِ آیات اوپر وَاِنْ تُطِعْ کے الفاظ میں اہلِ اضلال کے اتباع سے مطلقاً منع فرمایا تھا آگے باقتضائے ایک واقعہ کے ایک خاص امر میں اتباع کرنے سے منع فرماتے ہیں ، وہ خاص واقعہ مذبوح وغیر مذبوح کی حلت کا ہے ، واقعہ یہ ہے کہ کفار نے مسلمانوں کو شبہ ڈالنا چاہا کہ اللہ کے مارے ہوئے جانور کو تو کھاتے نہیں ہو اور اپنے مارے ہوئے یعنی ذبیحہ کو کھاتے ہو ، اخرجہ ابوداؤد والحاکم عن ابن عباسؓ ، بعض مسلمانوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ شبہ نقل کیا اس پر یہ آیتیں لَمُشْرِكُوْنَ تک نازل ہوئیں ، رواہ ابوداؤد والترمذی عن ابن عباسؓ کذا فی اللباب ۔

حاصلِ جواب یہ ہے کہ تم مسلمان ہو اللہ کے احکام کا التزام کئے ہوئے ہو ، اور اللہ تعالیٰ نے حلال وحرام کی تفصیل بتلادی ہے ، پس اس پر چلتے رہو ، حلال پر حرام ہونے کا اور حرام پر حلال ہونے کا شبہ مت کرو ، اور مشرکین کے وساوس کی طرف التفات نہ کرو ۔

اور تحقیق اس جواب کی یہ ہے کہ اصول کے اثبات کے لئے تو دلائلِ عقلیہ درکار ہیں اور بعد ثابت ہو جانے اصول کے اعمال وفروع میں صرف دلائلِ نقلیہ کافی ہیں ، عقلیات کی ضرورت نہیں ، بلکہ بعض اوقات مضر ہے کہ اس سے شبہات کے دروازے کھلتے ہیں ، کیونکہ فروع میں دلیلِ قطعی کی کوئی سبیل نہیں ، البتہ اگر کوئی طالبِ حق ہو جو اپنے شفائے قلب ہو اس کے روبرو اقناعیات وخطابیات کا تبرعاً پیش کر دینا مضائقہ نہیں ، لیکن جب یہ بھی نہ ہو بلکہ

۲۸

مجادلہ ہی ہو تو اپنے کام میں لگنا چاہیے ، اور معترض کی طرف التفات نہ کرنا چاہیے ، ہاں اگر معترض کسی شرع کا عقلِ قطعی دلیل کے مخالف ہونا ثابت کرنا چاہے تو اس کا جواب بذمہ مدعیِ حق ہوگا ، مگر مشرکین کے شبہ میں اس کا احتمال ہی نہیں ، اس لئے اس جواب میں صرف مسلمانوں کو بقاعدۂ مذکورہ بالا خطاب ہے ، کہ ایسی خرافات پر نظر مت کرو ، حق کے معتقد اور عامل رہو ، اس بناء پر اس مقام میں مشرکین کے شبہ کا جواب صراحۃً مذکور نہ ہونا محلِ شبہ نہیں ہو سکتا ، مگر اس پر بھی اس کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے ، جہاں كُلُوْا میں ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ اور لَا تَاْكُلُوْا میں لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ مذکور ہے ، اور یہ عادت سے اور دوسرے دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ ذبح کے وقت ہوگا اور لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ کے تحقق کی دو صورتیں ہوں گی ، عدمِ ذبح اور عدمِ ذکر عند الذبح ، پس حاصل جواب شبہ کا یہ ہوا کہ حلت کا مدار مجموعہ دو امر کا ہے ، ایک ذبح جو نجس خون کو نکال کر نجاست سے پاک کر دیتا ہے ، اور وہ نجاست ہی سببِ ممانعت تھی ، دوسرے اللہ کا نام لینا کہ مفید برکت ہے جو کہ حیواناتِ دمویہ میں شرطِ حلت ہے ، اور کسی چیز کے وجود کے لئے مانع کا دور کرنا اور شرط کا وجود دونوں امر ضروری ہیں ، پس اس مجموعہ سے حلت ثابت ہوگی ۔

خلاصۂ تفسیر

(اور جب اوپر کفار کے اتباع کا مذموم ہونا معلوم ہو گیا) سو جس (حلال) جانور پر (ذبح کے وقت) اللہ کا نام (بلا شرکت) لیا جاوے اس میں سے (بے تکلف) کھاؤ (اور اس کو مباح وحلال سمجھو) اگر تم اس کے احکام پر ایمان رکھتے ہو (کیونکہ حلال کو حرام جاننا خلافِ ایمان ہے) اور تم کو کون امر (از قبیل عقیدہ) اس کا باعث ہو سکتا ہے کہ تم ایسے جانوروں سے نہ کھاؤ جس پر (ذبح کے وقت) اللہ کا نام (بلا شرکت) لیا گیا ہو ، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے (دوسری آیت میں) ان سب جانوروں کی تفصیل بتلادی ہے جن کو تم پر حرام کیا ہے ، مگر وہ بھی جب تم کو سخت ضرورت پڑ جاوے تو حلال ہیں (اور اس تفصیل میں یہ مذبوح علی اسم اللہ داخل نہیں پھر اس کے کھانے میں اعتقاداً کیوں انقباض ہو) اور ان لوگوں کے شبہات کی طرف اصلاً التفات نہ کرو کیونکہ یہ یقینی بات ہے کہ بہت سے آدمی (کہ ان ہی میں سے یہ بھی ہیں اپنے ساتھ دوسروں کو بھی) اپنے غلط خیالات (کی بناء پر) بلا کسی سند کے گمراہ کرتے (پھرتے) ہیں (لیکن آخر کہاں تک خیر منا دیں گے) اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ حد (ایمان) سے نکل جانے والوں کو (جن میں یہ بھی ہیں) خوب جانتا ہے (پس یکبارگی سزا دیگا) اور تم ظاہری گناہ کو بھی چھوڑو اور باطنی گناہ کو بھی چھوڑ دو (مثلاً حلال کو حرام اعتقاد کرنا

باطنی گناہ ہے جیسا کہ اس کا عکس بھی) بلاشبہ جو لوگ گناہ کر رہے ہیں ان کو ان کے کئے کی عنقریب (قیامت میں) سزا ملے گی اور ایسے جانوروں میں سے مت کھاؤ جن پر (بطریق مذکور) اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو (جیسا کہ مشرکین ایسے جانوروں کو کھاتے ہیں) اور یہ امر (یعنی مالم یذکر اسم اللہ علیہ کا کھانا) بے حکمی ہے (غرض نہ ترک میں ان کا اتباع کرو اور نہ فعل میں) اور (ان لوگوں کے شبہات اس لئے قابلِ التفات نہیں کہ) یقیناً شیاطین (جن) اپنے (ان) دوستوں (اور پیروؤں) کو (یہ شبہات) تعلیم کر رہے ہیں تاکہ یہ تم سے (بیکار) جدال کریں (یعنی اول تو یہ شبہات نص کے خلاف، دوسرے غرض محض جدال اس لئے قابلِ التفات نہیں) اور اگر تم (خدانخواستہ) ان لوگوں کی اطاعت (عقائد یا افعال میں) کرنے لگو تو یقیناً تم مشرک ہو جاؤ (کہ خدا کی تعلیم پر دوسرے کی تعلیم کو ترجیح دو جہاں برابر سمجھنا بھی شرک ہے، یعنی ان کی اطاعت ایسی بُری چیز ہے اس لئے اس کے مقدمات یعنی التفات سے بھی بچنا چاہئے)

معارف و مسائل

مَا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ میں ذبح اختیاری اور ذبح اضطراری یعنی تیر باز اور کتے کا شکار جبکہ اس کے چھوڑنے کے وقت بسم اللہ پڑھی جاوے، اور ذکر حقیقی و ذکر حکمی سب داخل ہے، پس امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جس پر بسم اللہ سہواً ترک کر دی جاوے وہ حکماً مَا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ میں داخل ہے، البتہ عمداً ترک کرنے سے امام صاحب کے نزدیک حرام ہوتا ہے۔

أَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي
بھلا ایک شخص جو کہ مُردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کر دیا اور ہم نے اس کو وہ روشنی کر دی پھرتا ہو
النَّاسِ كَمَنْ مَثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِنْهَا ۚ
اس کو لوگوں میں برابر ہو سکتا ہے اس کے کہ جس کا حال یہ ہو کہ پڑا ہو اندھیروں میں وہاں سے نکل نہیں سکتا،
كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٢٢﴾
اسی طرح مزین کر دیئے کافروں کی نگاہ میں ان کے کام ؛ ؛ ؛

خلاصۂ تفسیر

ایسا شخص جو کہ پہلے مُردہ (یعنی گمراہ) تھا پھر ہم نے اس کو زندہ (یعنی مسلمان) بنا دیا

اور ہم نے اس کو ایک ایسا نور (یعنی ایمان) دیدیا کہ وہ اس کو لئے ہوئے آدمیوں میں چلتا پھرتا ہے، (یعنی ہر وقت وہ اس کے ساتھ رہتا ہے، جس سے وہ سب مضرتوں سے مثل گمراہی وغیرہ محفوظ اور مامون و بے فکر پھرتا ہے تو) کیا ایسا شخص (بدحالی میں)، اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جس کی حالت یہ ہو کہ وہ (گمراہی کی) تاریکیوں میں (گھرا ہوا) ہے (اور) ان سے نکلنے ہی نہیں پاتا (مراد یہ کہ وہ مسلمان نہیں ہوا، اور اس کا تعجب نہ کیا جاوے کہ کفر پر باوجود اس کے ظلمت ہونے کے وہ کیوں قائم رہا، وجہ یہ کہ جس طرح مؤمنین کو ان کا ایمان اچھا معلوم ہوتا ہے) اسی طرح کافروں کو ان کے اعمال (کفر وغیرہ) مستحسن معلوم ہوا کرتے ہیں (چنانچہ اسی وجہ سے یہ رؤسائے مکہ جو آپ سے مہمل فرمائشیں اور شبہات و مجادلات پیش کرتے رہتے ہیں اپنے کفر کو مستحسن ہی سمجھ کر اس پر مصر ہیں)۔

معارف و مسائل

پچھلی آیتوں میں پہلے اس کا ذکر آیا تھا کہ مخالفینِ اسلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے کھلے کھلے معجزات دیکھنے کے باوجود عناد اور ہٹ دھرمی سے نئے نئے معجزات کا مطالبہ کرتے ہیں، اس کے بعد قرآن نے بتلایا کہ اگر یہ لوگ واقعی حق طلب ہوتے تو جو معجزات ان کی آنکھوں کے سامنے آچکے ہیں وہ ان کو راہِ حق دکھانے کے لئے کافی سے بھی زیادہ تھے، پھر آن معجزات کا بیان آیا۔

مذکورہ آیت میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر ایمان لانے والوں اور کفر و انکار کرنے والوں کے کچھ حالات و خیالات اور دونوں کے نیک و بد انجام کا بیان اور مؤمن و کافر اور ایمان و کفر کی حقیقت کو مثالوں میں سمجھایا گیا ہے، مؤمن اور کافر کی مثال زندہ اور مردہ سے اور ایمان و کفر کی مثال روشنی اور اندھیری سے دی گئی ہے، یہ قرآنی تمثیلات ہیں جن میں کوئی شاعری نہیں ایک حقیقت کا اظہار ہے۔

مؤمن زندہ ہے اور کافر مُردہ اس تمثیل میں مؤمن کو زندہ اور کافر کو مُردہ بتلایا گیا ہے، وجہ یہ ہے کہ انسان اور حیوانات اور نباتات وغیرہ میں اگرچہ حیات اور زندگی کی قسمیں اور شکلیں مختلف ہیں، لیکن اتنی بات سے کوئی سمجھدار انسان انکار نہیں کر سکتا کہ ان میں سے ہر ایک کی زندگی کسی خاص مقصد کے لئے ہے، اور قدرت نے اس میں اس مقصد کو حاصل کرنے کی پوری اہلیت اور صلاحیت رکھی ہے، ارشادِ قرآنی أَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى میں اسی کا بیان ہے کہ اللہ جل شانہٗ نے کائناتِ عالم کی ہر چیز کو پیدا فرمایا اور اس کو جس مقصد کے لئے پیدا فرمایا تھا

اس تک پہونچنے کی اس کو پوری ہدایات دیدیں، جن کے ماتحت ہر مخلوق اپنے اپنے وظیفۂ زندگی اور اپنی اپنی ڈیوٹی کا حق ادا کر رہی ہے، اس عالم میں زمین، پانی اور ہوا اور آگ، اسی طرح آسمانی مخلوقات اور چاند، سورج اور بیشمار ستارے اپنی اپنی ڈیوٹی پوری طرح پہچان کر اپنے فرائض ادا کر رہے ہیں، اور یہی ادائے فرائض ان میں سے ہر چیز کی زندگی کا ثبوت ہے، اور جس وقت جس حال میں ان میں سے کوئی چیز اپنی ڈیوٹی ادا کرنا چھوڑ دے تو وہ زندہ نہیں بلکہ مردہ ہے، پانی اگر اپنا کام پیاس بجھانا اور میل کچیل دور کرنا وغیرہ چھوڑ دے تو وہ پانی نہیں کہلائے گا، آگ جلنا اور جلانا چھوڑ دے تو وہ آگ نہیں رہے گی، درخت اور گھاس اُگنا اور بڑھنا پھر پھل پھول لانا چھوڑ دے، تو وہ درخت اور نبات نہیں رہے گی، کیونکہ اس نے اپنے مقصدِ زندگی کو چھوڑ دیا، تو وہ ایک بے جان مُردہ کی طرح ہوگئی

تمام کائنات کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد ایک انسان جس میں کچھ بھی عقل و شعور ہو اس بات پر غور کرنے کے لئے مجبور ہوگا کہ انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے اور اس کی ڈیوٹی کیا ہے، اور یہ کہ اگر وہ اپنے مقصدِ زندگی کو پورا کر رہا ہے، تو وہ زندہ کہلانے کا مستحق ہے، اور اس کو پورا نہیں کرتا تو وہ ایک مُردہ لاش سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

اب سوچنا یہ ہے کہ انسان کا مقصدِ زندگی کیا اور اس کے فرائض کیا ہیں، اور مذکور الصدر اصول کے مطابق یہ متعین ہے کہ اگر وہ اپنے مقصدِ زندگی اور ڈیوٹی کو ادا کر رہا ہے تو زندہ ہے، ورنہ مردہ کہلانے کا مستحق ہے، جن بے بصیرت لوگوں نے انسان کو دنیا کی ایک خود رو گھاس یا ایک ہوشیار قسم کا جانور قرار دیدیا ہے اور ان کے نزدیک ایک انسان اور گدھے کتے میں کوئی امتیاز نہیں، ان سب کا مقصدِ زندگی انھوں نے اپنی نفسانی خواہشات پورا کرنا، کھانا پینا، سونا جاگنا، پھر مرجانا ہی قرار دے لیا ہے، وہ تو اہلِ عقل و شعور کے نزدیک قابلِ خطاب نہیں، عقلاءِ دنیا خواہ کسی مذہب و ملت اور کسی مکتبِ خیال سے تعلق رکھتے ہوں ابتداءِ عالم سے آج تک انسان کے مخدوم کائنات اور افضل المخلوقات ہونے پر متفق چلے آئے ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ افضل و اعلیٰ اسی چیز کو سمجھا اور کہا جاسکتا ہے جس کا مقصدِ زندگی اعلیٰ و افضل ہونے کے اعتبار سے ممتاز ہو، اور ہر سمجھ بوجھ والا انسان یہ بھی جانتا ہے کہ کھانے پینے، سونے جاگنے، رہنے سہنے، اوڑھنے پہننے میں انسان کو دوسرے جانوروں سے کوئی خاص امتیاز حاصل نہیں، بلکہ بہت سے جانور اس سے بہتر اور اس سے زیادہ کھاتے پیتے ہیں، اس سے بہتر قدرتی لباس میں ملبوس ہیں، اس سے بہتر ہوا و فضا میں رہتے بستے ہیں، اور جہاں تک اپنے نفع نقصان کے پہچاننے کا معاملہ ہے اس میں بھی ہر جانور بلکہ ہر درخت ایک حد تک باشعور ہے، مفید چیزوں کے حاصل کرنے اور مضر چیزوں سے بچنے کی خاصی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے،

اسی طرح دوسروں کے لئے نفع رسانی کے معاملہ میں تو تمام حیوانات اور نباتات کا قدم بقدم انسان سے بھی آگے نظر آتا ہے، کہ ان کے گوشت، کھال، ہڈی، پٹھے اور درختوں کی جڑ سے لیکر شاخوں..... اور پتوں تک ہر چیز مخلوق کے لئے کارآمد اور ان کی ضروریاتِ زندگی پیدا کرنے میں بے شمار فوائد کی حامل ہے، بخلاف انسان کے کہ نہ اس کا گوشت کسی کے کام آتا ہے نہ کھال، نہ بال نہ ہڈی نہ پٹھے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان حالات میں پھر حضرت انسان کس بناء پر مخدومِ کائنات اور افضل المخلوقات ٹھہرتے ہیں، اب حقیقت شناسی کی منزل قریب آپہونچی... ذرا سا غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان ساری چیزوں کے عقل و شعور کی رسائی صرف موجودہ زندگی کے وقتی اور ہنگامی نفع نقصان تک ہے، اور اسی زندگی میں وہ دوسروں کے لئے فائدہ بخش نظر آتی ہے، اس دنیا کی زندگی سے پہلے کیا تھا، اور بعد میں کیا آنے والا ہے، اس میدان میں جمادات نباتات تو کیا کسی بڑے سے بڑے ہوشیار جانور کی عقل و شعور بھی کام نہیں دیتی، اور نہ اس میدان میں ان میں سے کوئی چیز کسی کیلئے کارآمد یا مفید ہوسکتی ہے، بس یہی وہ میدان ہے جس میں مخدومِ کائنات اور افضل المخلوقات انسان کو کام کرنا ہے، اور اسی سے اس کا امتیاز دوسری مخلوقات سے واضح ہوسکتا ہے۔

معلوم ہوا کہ انسان کا مقصدِ زندگی پورے عالم کی ابتداء و انتہاء کو سامنے رکھ کر سب کے نتائج اور عواقب پر نظر ڈالنا اور یہ متعین کرنا کہ مجموعی اعتبار سے کیا چیز نافع اور مفید ہے، اور کونسی چیز مضر اور تکلیف دہ ہے، پھر اس بصیرت کے ساتھ خود اپنے لئے بھی مفید چیزوں کو حاصل کرنا اور مضر چیزوں سے بچنا اور دوسروں کو بھی ان مفید چیزوں کی طرف دعوت دینا اور بُری چیزوں سے بچانے کا اہتمام کرنا ہے، تاکہ دائمی راحت و سکون اور اطمینان کی زندگی حاصل ہوسکے، اور جب انسان کا مقصدِ زندگی اور کمالِ انسانی کا یہ معیاری فائدہ خود حاصل کرنا اور دوسروں کو پہونچانا ہے، تو اب قرآن کی یہ تمثیل حقیقت بنکر سامنے آجاتی ہے کہ زندہ صرف وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے، اور عالم کی ابتداء و انتہاء اور اس میں مجموعی اعتبار سے نفع و نقصان کو وحیِ الٰہی کی روشنی میں پہچانے کیونکہ نری عقلِ انسانی نے نہ کبھی اس میدان کو سر کیا ہے نہ کرسکتی ہے، بڑے بڑے عقلاء و حکماء اور فیلسوفانِ عالم نے انجام کار اس کا اقرار کیا ہے، مولانا رومیؒ نے خوب فرمایا ہے ؎

زیرکانِ موشگافانِ دہی
کردہ ہر خر علوم خطِ الٰہی

اور جب مقصد زندگی کے اعتبار سے زندہ صرف وہ شخص ہے جو وحیِ الٰہی کا تابع اور مومن ہو تو یہ بھی متعین ہو گیا کہ جو ایسا نہیں وہ مُردہ کہلانے کا مستحق ہے، مولانا رومیؒ نے خوب فرمایا ہے ؎

زندگی از بہر طاعت و بندگی است ٭ بے عبادت زندگی شرمندگی ست

آدمیت لحم و شحم و پوست نیست ٭ آدمیت جز رضائے دوست نیست

یہ قرآنی مثال تھی مومن و کافر کی، کہ مومن زندہ اور کافر مردہ ہے، دوسری مثال ایمان و کفر کی نور و ظلمت کے ساتھ دی گئی ہے۔

ایمان نور ہے اور کفر ظلمت ایمان کو نور اور کفر کو ظلمت اور اندھیری قرار دیا گیا ہے، ذرا غور کیا جائے تو یہ مثال بھی کوئی خیالی مثال نہیں، ایک حقیقت کا بیان ہے، یہاں بھی روشنی اور اندھیری کے اصل مقصد پر غور کیا جائے تو حقیقت سامنے آجائے گی کہ روشنی کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعہ نزدیک و دور کی اشیاء کو دیکھ سکیں، جس کے نتیجہ میں مضر چیزوں سے بچنے اور مفید کو اختیار کرنے کا موقع ملے۔

اب ایمان کو دیکھو کہ وہ ایک نور ہے جس کی روشنی تمام آسمانوں اور زمین اور ان سب سے باہر کی تمام چیزوں پر حاوی ہے، صرف یہی روشنی پورے عالم کے انجام اور تمام امور کے صحیح نتائج کو دکھا سکتی ہے، جس کے ساتھ یہ نور ہو تو وہ خود بھی تمام نقصان دہ و مضر چیزوں سے بچ سکتا ہے، اور دوسروں کو بھی بچا سکتا ہے، اور جس کو یہ روشنی حاصل نہیں وہ خود اندھیرے میں ہے، مجموعۂ عالم اور پوری زندگی کے اعتبار سے کیا چیز نافع ہے کیا مضر اس کا وہ کوئی امتیاز نہیں کر سکتا، صرف پاس پاس کی چیزوں کو ٹٹول کر کچھ پہچان سکتا ہے، موجودہ دنیا کی زندگی یہی آس پاس کا ماحول ہے، کافر اس زندگی اور اس کے نفع نقصان کو تو پہچان لیتا ہے، مگر بعد میں آنے والی دائمی زندگی کی اس کو کچھ خبر نہیں، نہ اُس کے نفع و ضرر کا اسے کچھ ادراک ہے، قرآن کریم نے اسی مضمون کے لئے ارشاد فرمایا ہے:

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ، یعنی یہ لوگ ظاہری دنیوی زندگی اور اس کے کھرے کھوٹے کو تو کچھ پہچانتے ہیں، مگر عالمِ آخرت سے قطعاً غافل ہیں۔

دوسری ایک آیت میں پچھلی منکر اور کافر امتوں کا ذکر کرنے کے بعد قرآن کریم نے فرمایا ہے: وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ، یعنی آخرت کے معاملہ میں ایسی شدید غفلت اور بے عقلی برتنے والے اس دنیا میں بیوقوف نادان نہ تھے، بلکہ مستبصرین یعنی روشن خیال لوگ تھے، مگر یہ ظاہری سطحی روشن خیالی صرف دنیا کی چند روزہ زندگی کے سنوارنے ہی میں کام دے سکی تھی

آخرت کی دائمی زندگی میں اس نے کچھ کام نہ دیا۔

اس تفصیل کو سننے کے بعد قرآن مجید کی آیت مذکورہ کو پھر ایک مرتبہ پڑھ لیجئے:

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا، مطلب یہ ہے کہ وہ شخص جو پہلے مردہ یعنی کافر تھا، پھر ہم نے اس کو زندہ کر دیا، یعنی مسلمان بنا دیا، اور ہم نے اس کو ایک ایسا نور یعنی ایمان دیدیا جس کو لئے ہوئے وہ لوگوں میں پھرتا ہے، اس شخص کی برابر ہو سکتا ہے جس کی مثال ایسی ہو کہ وہ قسم قسم کی اندھیریوں میں گھرا ہوا ہے، جس سے نکلنے نہیں پاتا، یعنی کفر کی اندھیریوں میں مبتلا ہے، وہ خود ہی اپنے نفع نقصان کو نہیں پہچانتا، اور ہلاکت سے نہیں بچ سکتا دوسروں کو کیا نفع پہنچا سکتا ہے۔

نورِ ایمان کا فائدہ دوسروں کو بھی پہنچتا ہے اس آیت میں يَمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ فرما کر اس طرف بھی ہدایت کر دی گئی ہے کہ نورِ ایمان صرف کسی مسجد یا خانقاہ یا گوشہ و حجرہ کے ساتھ مخصوص نہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے یہ نور دیا ہے وہ اس کو لے کر سب جگہ لوگوں کے ہجوم میں لئے پھرتا ہے، اور ہر جگہ اس روشنی سے خود بھی فائدہ اٹھاتا ہے، اور دوسروں کو بھی فائدہ پہونچاتا ہے، نور کسی ظلمت سے دب نہیں سکتا، جیسا کہ مشاہدہ ہے کہ ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ بھی اندھیرے میں مغلوب نہیں ہوتا، ہاں اس کی روشنی دور تک نہیں پہونچتی، تیز روشنی ہوتی ہے تو دور تک پھیلتی ہے، کم ہوتی ہے تو تھوڑی جگہ کو روشن کرتی ہے، مگر اندھیری پر بہرحال غالب ہی رہتی ہے، اندھیری اس پر غالب نہیں آتی، وہ روشنی ہی نہیں جو اندھیری سے مغلوب ہو جائے، اسی طرح وہ ایمان ہی نہیں جو کفر سے مغلوب یا مرعوب ہو جائے، یہ نورِ ایمان انسانی زندگی کے ہر شعبہ ہر حال ہر دور میں اس کے ساتھ ہے۔

اسی طرح اس مثال میں ایک اور اشارہ یہ بھی ہے کہ جس طرح روشنی کا فائدہ ہر انسان و حیوان کو ارادہ و بے ارادہ ہر حال میں کچھ نہ کچھ پہنچتا ہے، فرض کرو کہ نہ روشنی والا یہ چاہتا ہے کہ دوسرے کو فائدہ پہونچے، نہ دوسرا یہ قصد کر کے نکلا ہے کہ اس کی روشنی سے مجھے فائدہ پہنچے، مگر جب روشنی کسی کے ساتھ ہوگی تو اس سے جبری اور قدرتی طور پر سب کو ہی فائدہ پہنچے گا، اسی طرح مومن کے ایمان سے دوسروں کو بھی کچھ نہ کچھ فائدہ پہونچتا ہے، خواہ اس کو احساس ہو یا نہ ہو، آخر آیت میں ارشاد فرمایا كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ، یعنی ان واضح کھلے ہوئے دلائل کے باوجود منکرین اور کفار جو بات کو نہیں ملتے اس کی وجہ یہ ہو کہ ہر کس بخیالِ خویش خبطے دارد، شیطان اور نفسانی خواہشات نے انکی نظروں میں انکے بُرے اعمال ہی کو خوبصورت اور بھلا بنا رکھا ہے

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِىْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ۭ

اور اسی طرح کئے ہیں ہم نے ہر بستی میں گناہگاروں کے سردار کہ حیلے کیا کریں وہاں

وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝۱۲۳ وَاِذَا جَاۗءَتْهُمْ

اور جو حیلے کرتے ہیں سو اپنی ہی جان پر اور نہیں سوچتے ، اور جب آتی ہے ان کے

اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ

پاس کوئی آیت تو کہتے ہیں کہ ہم ہرگز نہ مانیں گے جب تک کہ نہ دیا جائے ہم کو جیسا کچھ کہ دیا گیا ہے

اللّٰهِ ڝ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ۭ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ

اللہ کے رسولوں کو ، اللہ خوب جانتا ہے اس موقع کو جہاں بھیجے اپنے پیغام ، عنقریب پہنچے گی

اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا كَانُوْا

گنہگاروں کو ذلت اللہ کے ہاں اور عذاب سخت اس وجہ سے کہ وہ

يَمْكُرُوْنَ ۝۱۲۴ فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ

مکر کرتے تھے ، سو جسکو اللہ چاہتا ہے کہ ہدایت کرے تو کھول دیتا ہے اس کے سینہ کو

لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا

واسطے قبول کرنے اسلام کے اور جسکو چاہتا ہے کہ گمراہ کرے کر دیتا ہے اس کے سینہ کو تنگ

حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاۗءِ ۭ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ

بے نہایت تنگ گویا وہ زور سے چڑھتا ہے آسمان پر اسی طرح ڈالے گا اللہ

الرِّجْسَ عَلَي الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۱۲۵

عذاب کو ایمان نہ لانے والوں پر

خلاصۂ تفسیر

اور یہ کوئی نئی بات نہیں ، جس طرح مکہ کے رؤساء ان جرائم کے مرتکب ہو رہے ہیں اور ان کے اثر سے دوسرے لوگ شامل ہو جاتے ہیں) اسی طرح ہم نے (پہلی امتوں میں بھی) ہر بستی میں وہاں کے رئیسوں ہی کو (اول) جرائم کا مرتکب بنایا، (پھر ان کے اثر سے اور عوام بھی ان سے مل گئے) تاکہ وہ لوگ وہاں (انبیاء کو ضرر پہنچانے کے لئے) شرارتیں کیا کریں ، (جن سے ان کا مستحق سزا ہونا خوب ثابت ہو جاوے) اور وہ لوگ (گو اپنے خیال میں

دوسروں کو ضرر پہنچاتے ہیں لیکن واقع میں) اپنے ہی ساتھ شرارت کر رہے ہیں (کیونکہ اس کا وبال تو انہی کو بھگتنا پڑے گا) اور (غایت جہل سے) ان کو (اس کی) ذرا خبر نہیں اور (ان کفار مکہ کا جرم یہاں تک بڑھ گیا ہے کہ) جب ان کو کوئی آیت پہنچتی ہے تو (باوجود اس کے کہ وہ اپنے اعجاز کی وجہ سے دلالۃ علی النبوۃ میں کافی ہوتی ، مگر یہ لوگ پھر بھی) یوں کہتے ہیں کہ ہم (ان نبی پر) ہرگز ایمان نہ لاویں گے ، جب تک کہ ہم کو بھی ایسی ہی چیز نہ دی جائے جو اللہ کے رسولوں کو دی جاتی ہے (یعنی وحی و خطاب یا صحیفہ و کتاب جس میں ہم کو آپ پر ایمان لانے کا حکم ہو، اور اس قول کا جرم عظیم ہونا ظاہر ہے کہ تکذیب اور عناد اور استکبار اور گستاخی سب اس کا جامع ہے، آگے اللہ تعالیٰ اس قول کو رد فرماتے ہیں کہ) اس موقع کو تو خدا ہی خوب جانتا ہے جہاں اپنا پیغام (وحی کے ذریعہ سے) بھیجتا ہے (کیا ہر کس و ناکس اس شرف کے قابل ہو گیا "تا نبخشد خدائے بخشندہ" آگے اس جرم کی سزا کا بیان ہے کہ) عنقریب ان لوگوں کو جنھوں نے یہ جرم کیا ہے خدا کے پاس پہنچ کر (یعنی آخرت میں) ذلت پہنچے گی (جیسا انھوں نے اپنے کو نبی کے مقابلہ میں عزت و نبوت کا مستحق سمجھا تھا) اور سزائے سخت (ملے گی) ان کی شرارتوں کے مقابلہ میں سو (اوپر جو مومن و کافر کا حال مذکور ہے، اس سے یہ معلوم ہوا کہ) جس شخص کو اللہ تعالیٰ (نجات کے) راستہ پر ڈالنا چاہتے ہیں اس کے سینہ (یعنی قلب) کو اسلام (کے قبول کرنے) کے لئے کشادہ کر دیتے ہیں (کہ اس کے قبول کرنے میں پس و پیش نہیں کرتا اور وہ نور مذکور یہی ہے) اور جس کو (تکوینا و تقدیرا) بے راہ رکھنا چاہتے ہیں اس کے سینہ (یعنی قلب) کو (اسلام کے قبول کرنے سے) تنگ (اور) بہت تنگ کر دیتے ہیں (اور اس کو اسلام لانا ایسا مصیبت نظر آتا ہے) جیسے کوئی (فرض کرو) آسمان میں چڑھنا چاہتا ہو (اور چڑھا نہیں جاتا اور جی تنگ ہوتا ہے اور مصیبت کا سامنا ہوتا ہو، پس جیسا اس شخص سے چڑھا نہیں جاتا) اسی طرح اللہ تعالیٰ ایمان نہ لانے والوں پر (چونکہ ان کے کفر اور شرارت کے سبب) پھٹکار ڈالتا ہے (اس لئے ان سے ایمان نہیں لایا جاتا)۔

معارف و مسائل

پچھلی آیت کے آخر میں یہ ذکر تھا کہ یہ دنیا دارالامتحان ہے، یہاں جس طرح اچھے اور نیک اعمال کے ساتھ کچھ محنت و مشقت لگی ہوئی ہے اُن کی راہ میں یہاں رکاوٹیں پیش آتی ہیں اسی طرح برے اعمال کے ساتھ چند روزہ نفسانی لذات اور خواہشات کا ایک فریب

ہوتا ہے جو حقیقت اور انجام سے غافل انسان کی نظر میں اُن بُرے اعمال ہی کو مزیّن کر دیتا ہے، اور دنیا کے بڑے بڑے ہوشیار اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

آیاتِ مذکورہ میں سے پہلی آیت میں اس کا بیان ہے کہ اسی امتحان اور آزمائش کا ایک رُخ یہ بھی ہے کہ ابتداءِ عالم سے یوں ہی ہوتا چلا آیا ہے کہ ہر بستی کے رئیس و مالدار اور بڑے لوگ ہی حقیقت اور انجام سے غافل چند روز کی فانی لذتوں میں مست ہو کر جرائم کے مرتکب ہوا کرتے ہیں، اور عوام کی عادت یہ ہوتی ہے کہ بڑے لوگوں کے پیچھے چلنے اور ان کی نقل اتارنے ہی کو اپنی سعادت اور کامیابی سمجھتے ہیں، اور انبیاء علیہم السلام اور ان کے نائب علماء و مشائخ جو اُن کو ان کے بُرے اعمال سے روکنا اور اس کے انجام کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں، یہ بڑے لوگ ان کے خلاف طرح طرح کی شرارتیں کیا کرتے ہیں، جو ظاہر میں تو ان بزرگوں کے خلاف شرارتیں اور سازشیں اور ان کی دل آزاری کا سامان ہوتا ہے، لیکن انجام کے اعتبار سے ان سب کا وبال خود انہی کی طرف لوٹتا ہے، اور اکثر دنیا میں بھی اس کا ظہور ہو جاتا ہے۔

اس ارشاد میں مسلمانوں کو اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ دنیا کے بڑوں اور رئیسوں مالداروں کی ریس نہ کریں، ان کے پیچھے چلنے کی عادت چھوڑیں، انجام بینی کو شعار بنائیں اور بھلے بُرے کو خود پہچانیں۔

نیز رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی دینا مقصود ہے کہ رؤسائے قریش جو آپ کی مخالفت پر لگے ہوئے ہیں اس سے آپ دل گیر نہ ہوں کہ یہ کوئی نئی بات نہیں، پچھلے انبیاء علیہم السلام کو بھی ایسے لوگوں سے سابقہ پڑا ہے، اور انجام کار وہ رُسوا اور ذلیل ہوئے اور اللہ کا کلمہ بلند ہوا۔

دوسری آیت میں انہی قریشی سرداروں کی ایک ایسی گفتگو کا ذکر ہے جو حق کے مقابلہ میں محض ہٹ دھرمی اور استہزاء و تمسخر کے انداز میں تھی، پھر اس کا جواب دیا گیا۔

امام بغویؒ نے بروایت قتادہ نقل کیا ہے کہ قریش کے سب سے بڑے سردار ابوجہل نے ایک مرتبہ کہا کہ بنو عبد مناف (یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان) سے ہم نے ہر محاذ پر مقابلہ کیا، جس میں کبھی ہم ان سے پیچھے نہیں رہے، لیکن اب وہ یوں کہتے ہیں کہ تم شرافت و بزرگی میں ہمارا مقابلہ اس لئے نہیں کر سکتے کہ ہمارے خاندان میں ایک نبی آئے ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آتی ہے، پھر کہا کہ میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ ہم کبھی ان کا اتباع نہ کریں گے، جب تک خود ہمارے پاس ایسی ہی وحی نہ آنے لگے، جیسی اُن کے پاس آتی ہے، آیت مذکورہ میں وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى

مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ کا یہی مطلب ہے۔

نبوت و رسالت کسبی اور اختیاری نہیں، بلکہ ایک عہدہ ہے جس کے عطا کرنے کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے

قرآن کریم نے یہ قول نقل کرنے کے بعد اب دیا، اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ، یعنی اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ وہ اپنی رسالت و نبوت کس کو عطا فرمائے، مطلب یہ ہے کہ اس بیوقوف نے اپنی جہالت سے یہ سمجھ رکھا ہے کہ نبوت اور پیغمبری خاندانی شرافت یا قوم کی سرداری اور مالداری کے ذریعہ حاصل کی جا سکتی ہے، حالانکہ نبوت اللہ تعالیٰ کی خلافت کا عہدہ ہے، جس کا حاصل کرنا کسی کے اختیار میں نہیں، کتنے ہی کمالات حاصل کر لینے کے بعد بھی کوئی اپنے اختیار سے یا کمال کے زور سے نبوت و رسالت حاصل نہیں کر سکتا وہ خالص عطائے حق جل شانہ ہے، وہ جس کو چاہتے ہیں عطا فرما دیتے ہیں۔

اس سے ثابت ہوا کہ رسالت و نبوت کوئی کسبی اور اختیاری چیز نہیں جس کو علمی، عملی کمالات یا مجاہدہ و ریاضت وغیرہ کے ذریعہ حاصل کیا جا سکے، کوئی شخص مقاماتِ ولایت میں کتنی ہی اونچی پرواز کر لے بھی نبوت حاصل نہیں کر سکتا، بلکہ وہ محض فضلِ خداوندی ہے جو خداوندی علم و حکمت کے ماتحت خاص بندوں کو دیا جاتا ہے، ہاں یہ ضروری ہے کہ جس شخص کو حق تعالیٰ کے علم میں یہ مقام اور عہدہ دینا منظور ہوتا ہے اس کو شروع ہی سے اس کے قابل بنا کر پیدا کیا جاتا ہے اس کے اخلاق و اعمال کی خاص تربیت کی جاتی ہے۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ ۝ اس میں لفظ صغار، حاصل مصدر ہے جس کے معنی ہیں ذلت و رسوائی، معنی اس جملہ کے یہ ہیں کہ یہ حق کے مخالف جو آج اپنی قوم میں بڑے اور رئیس کہلاتے ہیں عنقریب ان کی بڑائی اور عزت خاک میں ملنے والی ہے، ان کو اللہ تعالیٰ کے پاس سخت ذلت و رسوائی پہونچنے والی ہے، اور سخت عذاب ہونے والا ہے۔

اللہ کے پاس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قیامت کے روز جب یہ اللہ کے سامنے حاضر ہوں گے تو ذلیل و خوار ہو کر حاضر ہوں گے، اور پھر ان کو سخت عذاب دیا جائے گا، اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اگرچہ اس وقت ظاہر میں یہ بڑے عزت دار اور رئیس ہیں لیکن اللہ کی طرف سے ان کو سخت ذلت و رسوائی پہونچنے والی ہے، وہ دنیا میں بھی ہو سکتی ہے اور آخرت میں بھی، جیسا کہ انبیاء علیہم السلام کے مخالفین کے متعلق دنیا کی تاریخ میں اس کا مشاہدہ ہوتا رہا ہے، کہ انجام کار ان کے مخالفین دنیا میں بھی ذلیل ہوئے، ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے بڑے مخالفین جو اپنی عزت کی ڈینگ مارا کرتے تھے، ایک ایک کر کے یا تو دائرہ

اسلام میں داخل ہو گئے، اور جو نہ ہوئے تو ذلیل و خوار ہو کر ہلاک ہوئے، ابوجہل، ابولہب وغیرہ قریشی سرداروں کا حال دنیا کے سامنے آگیا، اور فتح مکہ نے ان سب کی کمر توڑ دیں۔

دین میں شرح صدر اور اس کی علامات

تیسری آیت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت پانے والوں اور گمراہی پر جمے رہنے والوں کے کچھ حالات اور علامات بتلائی گئی ہیں، ارشاد فرمایا، فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ، یعنی جس شخص کو اللہ تعالیٰ ہدایت دینا چاہتے ہیں اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتے ہیں۔

حاکم نے مستدرک میں اور بیہقی نے شعب الایمان میں بروایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرح صدر یعنی سینہ اسلام کے لئے کھول دینے کی تفسیر دریافت کی، آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ مؤمن کے دل میں ایک روشنی ڈال دیتے ہیں، جس سے اس کا دل حق بات کو دیکھنے سمجھنے اور قبول کرنے کے لئے کھل جاتا ہے (حق بات کو آسانی سے قبول کر لے لگتا ہے اور خلاف حق سے نفرت اور وحشت ہونے لگتی ہے) صحابہ کرام نے عرض کیا کہ کیا اس کی کوئی علامت بھی ہے جس سے وہ شخص پہچانا جائے جس کو شرح صدر حاصل ہو گیا ہے؟ فرمایا ہاں! علامت یہ ہے کہ اس شخص کی ساری رغبت آخرت اور اس کی نعمتوں کی طرف ہو جاتی ہے، دنیا کی بے جا خواہشات اور فانی لذتوں سے گھبراتا ہے، اور موت کے آنے سے پہلے موت کی تیاری کرنے لگتا ہے، پھر فرمایا وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ، یعنی جس شخص کو اللہ تعالیٰ گمراہی میں رکھنا چاہتے ہیں اس کا دل تنگ اور سخت تنگ کر دیتے ہیں، اس کو حق بات کا قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا ایسا دشوار ہوتا ہے جیسے کسی انسان کا آسمان میں چڑھنا۔

امام تفسیر کلبی نے فرمایا کہ اس کا دل تنگ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اس میں حق اور بھلائی کے لئے کوئی راستہ نہیں رہتا، یہ مضمون حضرت فاروق اعظمؓ سے بھی منقول ہے، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ جب اللہ کا ذکر سنتا ہے تو اس کو وحشت ہونے لگتی ہے، اور جب کفر و شرک کی باتیں سنتا ہے تو ان میں دل لگتا ہے۔

صحابہ کرام کو دین میں شرح صدر حاصل تھا اس لئے شکوک و شبہات بہت کم پیش آئے

یہی وجہ تھی کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جن کو حق تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور بلا واسطہ شاگردی کے لئے منتخب فرمایا تھا ان کو اسلامی احکام میں شبہات اور وساوس کم سے کم پیش آئے، ساری عمر میں صحابہ کرام نے جو سوالات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کے سامنے پیش کئے گئے وہ گنے چنے چند ہیں، وجہ یہ تھی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے اللہ تعالیٰ کی عظمت و محبت کا گہرا نقش ان کے دلوں میں بیٹھ گیا تھا، جس کے سبب ان کو شرح صدر کا مقام حاصل تھا ان کے قلوب خود بخود حق و باطل کا معیار بن گئے تھے، حق کو آسانی کے ساتھ فوراً قبول کرتے اور باطل ان کے دلوں میں راہ نہ پاتا تھا، پھر جوں جوں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے دوری ہوتی چلی گئی، شکوک و شبہات نے راہ پانی شروع کی، عقائد کے اختلافات پیدا ہونے شروع ہوئے۔

شکوک و شبہات کے دور کرنے کا اصل طریقہ بحث و مباحثہ نہیں شرح صدر کی تحصیل ہے

اور آج پوری دنیا ان شکوک و شبہات کے گھیرے میں پھنسی ہوئی ہے، اور بحث و مباحثہ کی راہ سے اس کو حل کرنا چاہتی ہے جو اس کا صحیح راستہ نہیں ہے۔

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں ☆ ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

راستہ وہی ہے جو صحابہ کرام اور اسلاف امت نے اختیار فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور ان کے انعام کا استحضار کر کے اس کی عظمت و محبت دل میں پیدا کی جائے، تو شبہات خود بخود کافور ہو جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ خود قرآن کریم نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعاء مانگنے کی تلقین فرمائی ہے کہ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ، یعنی اے میرے پروردگار میرا سینہ کھول دیجئے۔

آخر آیت میں فرمایا كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ، یعنی اسی طرح اللہ تعالیٰ ایمان نہ لانے والوں پر پھٹکار ڈال دیتا ہے، اور حق بات ان کے دل میں نہیں اترتی، اور ہر برائی اور سیہ روی کی طرف دوڑ دوڑ کر جاتے ہیں۔

وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا ۭ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ

اور یہ ہی رستہ تیرے رب کا سیدھا ہم نے واضح کر دیا نشانیوں کو غور

يَّذَّكَّرُوْنَ ۝ لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ

کرنے والوں کیواسطے انہی کے لئے ہے سلامتی کا گھر اپنے رب کے ہاں اور وہ ان کا مددگار ہے

بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ۚ يٰمَعْشَرَ

بسبب ان کے اعمال کے اور جس دن جمع کرے گا ان سب کو فرمائے گا اے جماعت

الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ ۚ وَقَالَ اَوْلِيٰٓـؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ

جنات کی تم نے بہت کچھ تابع کر لئے آدمیوں میں سے اور کہیں گے ان کے دوستدار آدمیوں میں

رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا ۭ

سے اے رب ہمارے کام نکالا ہم میں ایک نے دوسرے سے اور ہم پہنچے اپنے اس وعدہ کو جو تو نے ہمارے لئے مقرر کیا تھا

قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾

فرماویگا آگ ہے گھر تمہارا رہا کروگے اسی میں مگر جب چاہے اللہ البتہ تیرا رب حکمت والا خبردار ہے

خلاصۂ تفسیر

اور (اوپر جو اسلام کا ذکر ہوا تو) یہی (اسلام) تیرے رب کا (بتلایا ہوا) سیدھا رستہ ہے (جس پر چلنے سے نجات ہوتی ہے، جس کا ذکر فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ میں ہے، اور اسی صراط مستقیم کی توضیح کے لئے) ہم نے نصیحت حاصل کرنے والوں کے واسطے ان آیتوں کو صاف صاف بیان کردیا ہے (جس سے وہ اس کے اعجاز سے اس کی تصدیق کریں اور پھر اس کے مضامین پر عمل کرکے نجات حاصل کریں، یہی تصدیق و عمل صراط مستقیم کا مال ہے، بخلاف اُن کے جن کو نصیحت حاصل کرنے کی فکر ہی نہیں اُن کے واسطے نہ یہ کافی نہ دوسرے دلائل کافی، آگے ان ماننے والوں کی جزاء کا ذکر ہے، جیسا نہ ماننے والوں کی سزا اوپر کئی جملوں میں مذکور ہوئی، پس ارشاد ہے کہ) ان لوگوں کے واسطے ان کے رب کے پاس (پہنچ کر) سلامتی (یعنی امن و بقاء) کا گھر (یعنی جنت) ہے اور اللہ ان سے محبت رکھتا ہے ان کے اعمال (حسنہ) کی وجہ سے اور (وہ دن یاد کرنے کے قابل ہے) جس روز اللہ تعالیٰ تمام خلائق کو جمع کریں گے (اور ان میں سے بالخصوص کفار کو حاضر کرکے ان میں جو شیاطین الجن ہیں ان سے تو یوں کہا جاوے گا کہ) اے جماعت جنات کی تم نے انسانوں (کے گمراہ کرنے) میں بڑا حصہ لیا (اور ان کو خوب بہکایا اسی طرح انسانوں سے پوچھا جاوے گا اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ الخ غرض شیاطین الجن بھی اقرار کریں گے) اور جو انسان ان (شیاطین جن) کے ساتھ تعلق رکھنے والے تھے وہ (بھی اقرار آ) کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار (آپ صحیح فرماتے ہیں واقعی) ہم میں ایک نے دوسرے سے (اس ضلال و اضلال کے باب میں نفسانی) فائدہ حاصل کیا تھا (چنانچہ گمراہ انسانوں کو اپنے عقائد کفریہ و شرکیہ میں لذت آتی ہے اور گمراہ کنندہ شیاطین کو اس سے حظ ہوتا ہوگا کہ ہمارا کہنا چل گیا) اور (فی الحقیقت ہم ان کے بہکانے سے قیامت کے منکر تھے، لیکن وہ انکار غلط ثابت ہوا، چنانچہ) ہم اپنی اس معین میعاد تک آپہنچے جو آپ نے ہمارے لئے معین فرمائی (یعنی قیامت آگئی) اللہ تعالیٰ (سب کفار جن و انس سے) فرمادیں گے کہ تم سب کا ٹھکانا دوزخ ہے جس میں ہمیشہ کو رہوگے، (کوئی نکلنے کی سبیل و تدبیر نہیں،

ہاں! اگر خدا ہی کو نکالنا منظور ہو تو دوسری بات ہے، لیکن یہ یقینی ہے کہ خدا بھی نہیں چاہے گا اس لئے ہمیشہ رہا کرو) بیشک آپ کا رب بڑی حکمت والا اور بڑا علم والا ہے (علم سے سب کے جرائم معلوم کرتا ہے اور حکمت سے مناسب سزا دیتا ہے)۔

معارف و مسائل

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے ارشاد فرمایا وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا، یعنی "یہ راستہ تیرے رب کا ہے سیدھا"۔ اس میں لفظ ھٰذا سے بقول ابن مسعودؓ قرآن کی طرف اور بقول ابن عباسؓ اسلام کی طرف اشارہ ہے (روح) معنی یہ ہیں کہ یہ قرآن یا شریعت اسلام جو آپ کو دی گئی ہے، یہ راستہ آپ کے رب کا ہے، یعنی ایسا راستہ ہے جس کو آپ کے پروردگار نے اپنی حکمت بالغہ سے تجویز فرمایا اور اس کو پسند کیا ہے، اس میں راستہ کی اضافت و نسبت پروردگار کی طرف کرکے اس طرف اشارہ فرمادیا کہ قرآن اور اسلام کا جو دستور العمل آپ کو دیا گیا ہے اس پر عمل کرنا کچھ اللہ تعالیٰ کے فائدہ کے لئے نہیں بلکہ عمل کرنیوالوں کے فائدہ کے لئے شان پروردگاری کے تقاضہ کی بنا پر ہے اس کے ذریعہ انسان کی ایسی تربیت کرنا مقصود ہے جو اس کی دائمی فلاح و بہبود کی ضامن ہو۔

پھر اس میں لفظ ربّ کی نسبت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرکے آپ پر ایک خاص لطف و عنایت کا اظہار فرمایا گیا ہے کہ آپ کے پروردگار نے یہ راستہ تجویز فرمایا ہے، اس نسبت کا لطف اہل ذوق ہی محسوس کرسکتے ہیں کہ ایک بندہ کو اپنے رب اور معبود کی طرف کوئی ادنیٰ نسبت حاصل ہوجانا بھی اس کے لئے انتہائی فخر کی چیز ہے، اور اگر ربّ الارباب اور معبود کائنات اپنے آپ کو اس کی طرف منسوب کرے کہ میں تیرا ہوں تو اس کی قسمت کا کیا کہنا، حضرت حسن نظامیؒ اسی مقام سے فرماتے ہیں ؎

بندہ حسن بصد زبان گفت کہ بندۂ توام ۔۔۔ تو بزبان خود بگو کہ بندہ نواز کیستی

اس کے بعد اس قرآنی راستہ کا یہ حال لفظ مُسْتَقِيْمًا سے بیان کیا گیا کہ یہ راستہ سیدھا راستہ ہے، اس میں بھی مستقیم کو صراط کی صفت کے طور پر لانے کے بجائے حال کے طریقے سے ذکر کرکے اس طرف اشارہ کردیا کہ جو رستہ پروردگار عالم کا تجویز کیا ہوا ہے، اس میں بجز مستقیم اور سیدھا ہونے کے اور کوئی احتمال ہو ہی نہیں سکتا (روح و بحر)

اس کے بعد فرمایا قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ۔ یعنی ہم نے نصیحت قبول کرنے والوں کے واسطے ان آیتوں کو صاف صاف بیان کردیا ہے۔

فَصَّلْنَا، تفصیل سے بنا ہے، تفصیل کے اصلی معنی یہ ہیں کہ مضمون کا تجزیہ کرکے ایک ایک فصل کو الگ الگ بیان کیا جائے، اس طریقہ پر پورا مضمون ذہن نشین ہوجاتا ہے، اس لئے تفصیل کا حاصل صاف صاف بیان کرنا ہوگیا، مطلب یہ ہے کہ ہم نے بنیادی اور اصولی مسائل کو صاف صاف تفصیل کے ساتھ بیان کردیا ہے، جس میں کوئی اجمال یا ابہام باقی نہیں چھوڑا، اس میں لِقَوْمٍ یَّذَّکَّرُوْنَ فرماکر یہ بتلا دیا کہ اگرچہ قرآنی ارشادات بالکل واضح اور صاف ہیں، لیکن ان سے فائدہ انہی لوگوں نے اٹھایا جو نصیحت حاصل کرنے کے قصد سے قرآن میں غور کرتے ہیں، ضد اور عناد یا آبائی رسوم کی تقلید جاہلہ کے پردے ان کے درمیان حائل نہیں ہوتے۔

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ، یعنی جن لوگوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ وہ قرآنی ہدایتوں کو خالی الذہن ہوکر نصیحت حاصل کرنے کے لئے دیکھتے اور سنتے ہیں، اور اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر ان ہدایتوں کو قبول کرتے ہیں، ان کے لئے ان کے رب کے پاس دارالسلام کا انعام موجود اور محفوظ ہے، اس میں لفظ دار کے معنی گھر اور سلام کے معنی تمام آفتوں، مصیبتوں اور محنتوں سے سلامتی کے ہیں، اس لئے دارالسلام اس گھر کو کہا جاسکتا ہے جس میں کسی تکلیف و مشقت اور رنج و غم اور آفت و مصیبت کا گذر نہ ہو، اور وہ ظاہر ہے کہ جنت ہی ہوسکتی ہے۔

اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ سلام اللہ جل شانہ کا نام ہے، اور دارالسلام کے معنی ہیں اللہ کا گھر اور ظاہر ہے کہ اللہ کا گھر امن و سلامتی کی جگہ ہوتی ہے، اس لئے حاصل معنی پھر بھی یہی ہوگئے کہ وہ گھر جس میں ہر طرح کا امن و سکون اور سلامتی و اطمینان ہو وجنت کو دارالسلام فرماکر اس طرف اشارہ کردیا کہ جنت ہی صرف وہ جگہ ہے جہاں انسان کو ہر قسم کی تکلیف، پریشانی اور اذیت اور ہر خلاف طبع چیز سے مکمل اور دائمی سلامتی حاصل ہوتی ہے جو دنیا میں نہ کسی بڑے سے بڑے بادشاہ کو کبھی حاصل ہوئی اور نہ بڑے سے بڑے نبی و رسول کو، کیونکہ دنیائے فانی کا یہ عالم ایسی مکمل اور دائمی راحت کا مقام ہی نہیں۔

اس آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ ان نیک بخت لوگوں ۔۔۔۔ کے لئے ان کے رب کے پاس دارالسلام ہے، رب کے پاس ہونے کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ یہ دارالسلام یہاں نقد نہیں ملتا بلکہ جب وہ قیامت کے روز اپنے رب کے پاس جائیں گے اس وقت ملے گا، اور یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ دارالسلام کا وعدہ غلط نہیں ہوسکتا، رب کریم اس کا ضامن ہے وہ اس کے پاس محفوظ ہے اور اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اس دارالسلام کی نعمتوں اور راحتوں کو آج کوئی تصور میں بھی نہیں لاسکتا، رب ہی جانتا ہے جس کے پاس یہ خزانہ محفوظ ہے۔

اور اس دوسرے معنی کی رُو سے اس دارالسلام کا ملنا قیامت اور آخرت پر موقوف نہیں

معلوم ہوتا، بلکہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ رب کریم جسکو چاہیں اسی عالم میں دارالسلام نصیب کرسکتے ہیں، کہ تمام آفات اور مصائب سے امن نصیب فرمادیں، خواہ اس طرح کہ دنیا میں کوئی آفت و مصیبت ہی ان کو نہ پہنچے جیسا کہ انبیاء سابقین اور اولیاء اللہ میں اس کی بھی نظائر موجود ہیں، اور یا اس طرح کہ نعمائے آخرت کو ان کے سامنے مستحضر کرکے ان کی نگاہ کو ایسا حقیقت شناس بنادیا گیا جس سے دنیا کی چندروزہ تکلیف و مصیبت ان کی نظروں میں حقیر ناقابل التفات چیز نظر آنے لگتی ہے، مصائب کے پہاڑ بھی ان کے سامنے پرکاہ سے کم رہ جاتے ہیں ؎

رنج راحت شد چو مطلب شد بزرگ ۔ گرد گلہ توتیائے چشم گرگ

دنیا کی تکالیف کے بالمقابل جو انعامات ملنے والے ہیں وہ ان کے سامنے ایسے مستحضر ہوجاتے ہیں کہ یہ تکالیف بھی ان کو لذیذ معلوم ہونے لگتی ہیں، اور یہ کوئی مستبعد نہیں، دیکھو آخرت کی دائمی نعمتیں تو بڑی چیز ہیں، یہ دنیا کی فانی اور چندروزہ راحت کا تصور انسان کے لئے کیسی کیسی محنت و مشقت کو لذیذ بنادیتا ہے، کہ سفارشیں اور رشوتیں پیش کرکے آزادی کی راحت کو قربان کرتا ہے، اور نیند و آرام کو ختم کرنے والی ملازمت و مزدوری کی محنت کو شوق سے طلب کرتا ہے، اور اس محنت کے مل جانے پر مسرور و شکرگذار ہوتا ہے، کیونکہ اس کے سامنے انتیس دن پورے ہوجانے کے بعد حاصل ہونے والی تنخواہ کی لذت ہوتی ہے، وہ لذت اس ملازمت و مزدوری کی سب تلخیوں کو لذیذ بنادیتی ہے، قرآن کریم کی آیت وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ کی ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ خدا تعالیٰ سے ڈرنے والوں کو دو جنتیں ملیں گی، ایک آخرت میں دوسری دنیا میں، دنیا کی جنت یہی ہوتی ہے کہ اول تو اس کے ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی مدد شامل ہوتی ہے، ہر کام آسان ہوتا نظر آتا ہے، اور کبھی چندروزہ تکلیف و مشقت یا ناکامی بھی ہوتی ہے تو نعمائے آخرت کے مقابلہ میں وہ بھی ان کو لذیذ نظر آتی ہے، جس سے یہ تکلیف بھی راحت کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں نیک لوگوں کے لئے ان کے رب کے پاس دارالسلام ہونے کا جو ذکر ہے وہ دارالسلام آخرت میں تو یقینی اور متعین ہے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس دنیا میں بھی ان کو دارالسلام کا لطف دیدیا جائے۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا، وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ، یعنی اُن کے اعمال صالحہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کا متولی اور متکفل اور ناصر و مددگار ہوجاتا ہے، ان کی سب مشکلات آسان ہوجاتی ہیں۔

تیسری آیت میں میدان حشر کے اندر تمام جنات اور انسانوں کو جمع کرنے کے بعد دونوں گروہوں کی ایک سوال و جواب کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ شیاطین الجن کو خطاب کرکے ان کے جرم کا

اظہار اس طرح فرمائیں گے کہ تم نے انسانوں کی گمراہی میں بڑا حصہ لیا ہے، اس کے جواب میں جنات کیا کہیں گے قرآن نے اس کا ذکر نہیں کیا، ظاہر یہی ہے کہ علیم و خبیر کے سامنے اقرار کرنے کے سوا چارہ کیا ہے، مگر ان کا اقرار ذکر نہ کرنے میں یہ اشارہ ہے کہ اس سوال پر وہ ایسے مبہوت ہو جائیں گے کہ جواب کیلئے زبان نہ اٹھ سکے گی (روح)

اس کے بعد شیاطین الانس یعنی وہ لوگ جو دنیا میں شیطانوں کے تابع رہے خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کی گمراہی کا سبب بنتے رہے ان لوگوں کی طرف سے بارگاہ احکم الحاکمین میں ایک جواب ذکر کیا گیا ہے، اگرچہ سوال شیاطین الانس سے نہیں کیا گیا، مگر ضمنی طور پر گویا وہ بھی مخاطب تھے، کیونکہ انہوں نے بھی گمراہی پھیلانے کا وہی کام کیا تھا، جو شیاطین الجن کا کام تھا، اس ضمنی خطاب کی وجہ سے ان لوگوں نے جواب دیا، مگر ظاہر یہ ہے کہ خود انسان نما شیطانوں سے بھی سوال ہوگا، جس کا ذکر صراحۃً اگرچہ یہاں نہیں ہے، مگر سورۂ یٰسٓ کی اس آیت میں مذکور ہے، اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ، یعنی اے بنی آدم کیا ہم نے تم سے رسولوں کے واسطے سے یہ نہ کہا تھا کہ شیطان کی پیروی کرنا۔

جس سے معلوم ہوا کہ انسانی شیطانوں سے بھی اس موقع پر سوال ہوگا اور وہ جواب میں اقرار کریں گے کہ بیشک ہم سے یہ جرم سرزد ہوا کہ ہم نے شیطانوں کی بات مانی اور یہ کہیں گے کہ بیشک جنی شیاطین نے ہم سے اور ہم نے ان سے دوستانہ تعلقات رکھ کر ایک دوسرے سے نفع حاصل کیا، انسانی شیطانوں نے تو ان سے یہ فائدہ حاصل کیا کہ دنیا کی لذتیں حاصل کرنے کی راہیں سیکھیں، اور کہیں کہیں جنات شیاطین کی دُہائی دے کر یا کسی دوسرے طریق سے ان سے امداد بھی حاصل کی، جیسے بت پرست ہندوؤں میں بلکہ بعض جاہل مسلمانوں میں بھی ایسے طریقے معروف ہیں جن کے ذریعہ شیاطین اور جنات سے بعض کاموں میں امداد لے سکتے ہیں، اور جنی شیطانوں نے انسانوں سے یہ فائدہ حاصل کیا کہ ان کی بات مان لی گئی، اور یہ انسان کو اپنے تابع بنانے میں کامیاب ہو گئے، یہاں تک کہ وہ موت اور آخرت کو بھول بیٹھے، اور اس وقت ان لوگوں نے اقرار کیا کہ جس موت اور آخرت کو ہم شیطان کے بہکانے سے بھول بیٹھے تھے اب وہ سامنے آ گئی، اس پر حق تعالیٰ کا ارشاد ہوگا: اَلنَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَاۗءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ۔ یعنی تم دونوں گروہوں کے جرم کی سزا اب یہ ہے کہ تمہارا ٹھکانا آگ ہے، جس میں ہمیشہ رہو گے، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی اس سے کسی کو نکالنا چاہے، لیکن دوسری نصوص میں قرآن شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی نہیں چاہے گا، اس لئے ہمیشہ ہی رہنا پڑے گا۔

وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًۢا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۲۹﴾ ۱۵ ع ۸ ۲

اور اسی طرح ہم ساتھ ملا دیں گے گنہگاروں کو ایک دوسرے سے ان کے اعمال کے سبب

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ

اے جماعت جنوں کی اور انسانوں کی کیا نہیں پہنچے تھے تمہارے پاس رسول تم ہی میں کے کہ سناتے تھے

عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَاۗءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۭ قَالُوْا شَهِدْنَا

تم کو میرے حکم اور ڈراتے تھے تم کو اس دن کے پیش آنے سے کہیں گے کہ ہم نے اقرار کر لیا

عَلٰٓي اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ

اپنے گناہ کا اور ان کو دھوکہ دیا دنیا کی زندگی نے اور قائل ہو گئے اپنے اوپر

اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰي

اس بات کے کہ وہ کافر تھے یہ اس واسطے کہ تیرا رب ہلاک کرنیوالا نہیں بستیوں کو

بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۭ وَمَا

ان کے ظلم پر اور وہاں کے لوگ بے خبر ہوں اور ہر ایک کے لئے درجے ہیں ان کے عمل کے اور

رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۲﴾

تیرا رب بے خبر نہیں اُن کے کام سے

خلاصۂ تفسیر

اور (جس طرح دنیا میں گمراہی کے لحاظ سے سب میں تعلق و قرب تھا) اسی طرح (دوزخ میں) بعض کفار کو بعض کے قریب (اور مجتمع) رکھیں گے ان کے اعمال (کفریہ) کے سبب (یہ خطاب مذکور تو جن و انس کو باعتبار اُن کے احوال متعلقہ باہم دگر کے تھا، آگے ہر ایک کو باعتبار احوال متعلقہ بذات خاص کے خطاب ہے کہ) اے جماعت جنات اور انسانوں کی (وہاں یہ تو بتلاؤ جو تم کفر و انکار کرتے رہے تو) کیا تمہارے پاس تم ہی میں کے پیغمبر نہیں آئے تھے جو تم سے میرے احکام (متعلق عقائد و اعمال کے) بیان کیا کرتے تھے اور تم کو اس آج کے دن (کے وقوع) کی خبر دیا کرتے تھے (پھر کیا وجہ کہ تم کفر و انکار سے باز نہ آئے) وہ سب عرض کریں گے کہ ہم سب اپنے اوپر (جرم کا) اقرار کرتے ہیں (ہمارے پاس کوئی وجہ عذر اور برأت کی نہیں، آگے اللہ تعالیٰ ان کو اس مصیبت کے پیش آنے کا سبب بتلاتے ہیں) اور ان کو (یہاں) دنیوی زندگانی نے بھول میں ڈال رکھا ہے (کہ دنیوی لذات کو مقصود اعظم سمجھ رکھا ہے آخرت کی فکر ہی نہیں) اور (اس کا ثمرہ یہ ہوا کہ وہاں) یہ لوگ مقر ہوں گے کہ وہ (یعنی ہم) کافر تھے (اور غلطی پر تھے، مگر وہاں کے اقرار سے کیا ہوتا ہے، اگر دنیا میں ذرا غفلت دور کر دیں تو اس روزِ بد کا کیوں سامنا ہو، آگے رسولوں کے بھیجنے میں جس کا اوپر ذکر تھا اپنی رحمت کا اظہار فرماتے ہیں کہ) یہ (رسولوں کا بھیجنا) اس وجہ سے ہے کہ آپ کا رب کسی بستی والوں کو ان کے کفر کے سبب (دنیا میں بھی) ایسی حالت میں ہلاک نہیں کرتا کہ اس بستی کے رہنے والے (احکام

آگئیں سے بوجہ رسولوں کے نہ آنے کے) بیخبر ہوں (پس عذاب آخرت کہ اشد ہے بدرجۂ اولیٰ نہ ہوتا، اس لئے رسولوں کو بھیجتے ہیں تاکہ ان کو جرائم کی اطلاع ہو جاوے پھر جس کو عذاب ہو استحقاق کی وجہ سے ہو، چنانچہ آگے فرماتے ہیں) اور (جب رسول آگئے اور اطلاع ہوگئی پھر جیسا جیسا کوئی کرے گا) ہر ایک کیلئے (جن وانس صالح وطالح میں سے جزاء وسزا کے ویسے ہی) درجے ملیں گے ان کے اعمال کے سبب اور آپ کا رب ان کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔

معارف ومسائل

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت میں لفظ نُوَلِّیْ کے عربی لغت کے اعتبار سے دو ترجمے ہوسکتے ہیں، ایک ملا دینے اور قریب کر دینے کے اور دوسرے مسلط کر دینے کے، ائمہ تفسیر صحابہ و تابعین سے بھی دونوں طرح کی روایات میں اس کی تفسیر منقول ہے۔

محشر میں لوگوں کی جماعتیں اعمال واخلاق کی بنیاد پر ہوں گی دنیوی تعلقات کی بنیاد پر نہیں

حضرت سعید بن جبیرؓ اور قتادہؒ وغیرہ نے پہلا ترجمہ اختیار کر کے آیت کا یہ مطلب قرار دیا ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے یہاں اجتماعی وحدتیں یعنی لوگوں کی جماعتیں اور پارٹیاں نسلی یا وطنی یا رنگ وزبان کی بناء پر نہیں بلکہ اعمال واخلاق کے اعتبار سے ہوں گی، اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار مسلمان جہاں کہیں ہوگا وہ مسلمانوں کا ساتھی ہوگا، اور نافرمان کافر جہاں کہیں ہوگا وہ کافروں کا ساتھی ہوگا، خواہ ان کی نسل اور نسب میں، وطن اور زبان میں، رنگ اور معاشرت میں کتنا ہی بُعد اور اختلاف ہو۔

پھر مسلمانوں میں بھی نیک، دیندار، دینداروں کے ساتھ ہوگا، اور گناہگار، بدکردار، بدکرداروں کے ساتھ لگا دیا جائے گا، سورۂ تکویر میں جو ارشاد ہے وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ یعنی لوگوں کے جوڑ اور جماعتیں بنادی جائیں گی، اس کا بھی مطلب ہے کہ اعمال واخلاق کے اعتبار سے اہل محشر مختلف جماعتوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔

حضرت فاروق اعظمؓ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ ایک قسم کے اعمال نیک یا بد کرنیوالے ایک ساتھ کر دیئے جائیں گے، نیک آدمی نیکوں کے ساتھ جنت میں، اور بدکردار دوسرے بدکرداروں کے ساتھ جہنم میں پہنچا دیا جائے گا، اور اس مضمون کی توثیق کے لئے فاروق اعظمؓ نے قرآن کریم کی آیت اُحْشُرُوا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ سے استدلال فرمایا جس کا مضمون یہی ہے کہ قیامت کے دن حکم ہوگا کہ ظالموں کو اور ان کے مناسب عمل کرنے والوں کو جہنم میں لے جاؤ۔

خلاصہ مضمون آیت مذکورہ کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض ظالموں کو دوسرے ظالموں کا ساتھی بنا کر ایک جماعت کر دیں گے، اگرچہ نسلی اور وطنی اعتبار سے ان میں کتنی بھی دوری ہو۔

اور ایک دوسری آیت میں یہ بات بھی واضح طور پر بیان فرما دی ہے کہ محشر میں یہ دنیوی اور رسمی اتحاد جو آج لوگوں میں نسل، وطن، رنگ، زبان وغیرہ کی بنیادوں پر قائم ہیں، یہ سب یکسر ٹوٹ جائیں گے، وَیَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ یَوْمَئِذٍ یَّتَفَرَّقُوْنَ، یعنی جب قیامت قائم ہوگی تو جو لوگ آپس میں متحد و متفق ہیں وہ متفرق ہو جائیں گے۔

دنیا میں بھی اعمال واخلاق کا اجتماعی معاملات میں اثر

اور یہ موجودہ رشتوں ناطوں اور رسمی تنظیموں کا کٹ جانا روزِ قیامت میں تو واضح اور مکمل طور پر سب کے سامنے آہی جائے گا، مگر دنیا میں بھی اس کا ایک ادنیٰ سا نمونہ ہر جگہ پایا جاتا ہے کہ نیک آدمی کو نیکوں سے مناسبت ہوتی ہے، انہی کی جماعت اور سوسائٹی سے وابستہ ہوتا ہے، اور اس طرح نیک کاموں میں اس کے لئے راستے کھلتے... نظر آتے ہیں اور ارادہ مضبوط ہوتا جاتا ہے، اسی طرح بدکردار کو اپنے ہی جیسے بدکرداروں سے تعلق اور اُنس ہوتا ہے وہ انھیں میں اُٹھتا بیٹھتا ہے، اور ان کی صحبت سے اس کی بدعملی و بدخلقی میں روز نیا اضافہ ہوتا رہتا ہے اور نیکی کے راستے اس کے سامنے سے بند ہوتے جاتے ہیں، یہ اس کے بُرے عمل کی نقد سزا اسی دنیا میں ملتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ نیک و بد اعمال کی ایک جزاء سزا تو آخرت میں ملے گی اور ایک جزاء سزا نقد اسی دنیا میں اس طرح مل جاتی ہے کہ نیک آدمی کو رفقاءِ کار بھی نیک اور دیانتدار نصیب ہو جاتے ہیں جو اس کے کام کو چار چاند لگا دیتے ہیں، اور بُرے اور بدنیت آدمی کو اعضاء و جوارح اور رفقاءِ کار بھی اسی جیسے ملتے ہیں جو اس کو اور بھی زیادہ گہرے غار میں دھکیل دیتے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بادشاہ اور حاکم سے راضی ہوتے ہیں تو اس کو اچھے وزیر اور اچھا عملہ دیدیتے ہیں جس سے اس کی حکومت کے سب کاروبار درست اور ترقی پذیر ہو جاتے ہیں، اور جب کسی سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں تو اس کو عملہ اور رفقاءِ کار بُرے ملتے ہیں، بُرے افسروں سے پالا پڑتا ہے، وہ اگر کوئی اچھا کام کرنے کا ارادہ بھی کرتا ہے تو اس پر قابو نہیں پاتا۔

ایک ظالم کو دوسرے ظالم کے ہاتھ سے سزا ملتی ہے

آیت مذکورہ کا یہ مفہوم ترجمہ کے اعتبار سے ہے، اور حضرت عبداللہ ابن عباسؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، ابن زیدؓ، مالک بن دینار وغیرہ سے اس آیت کی تفسیر دوسرے ترجمہ کے اعتبار سے یہ منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ بعضے ظالموں کو دوسرے ظالموں پر مسلط کر دیتا ہے، اور اس طرح ایک ظالم کو دوسرے ظالم کے ہاتھ سے سزا دلوا دیتا ہے، یہ مضمون بھی اپنی جگہ صحیح و درست اور قرآن و حدیث کے دوسرے ارشادات کے مطابق ہے، ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کَمَا تَكُوْنُوْنَ كَذٰلِكَ يُؤَمَّرُ عَلَيْكُمْ یعنی

جیسے تم ہوگے ویسے ہی حکام تم پر مسلط ہوں گے، تم ظالم و بدکار ہوگے تو تمہارے حاکم بھی ظالم و بدکار ہی ہوں گے اور تم نیک عمل و نیک کردار ہوگے تو اللہ تعالیٰ تمہارے حکام نیک اور رحم دل منصف مزاج لوگوں کو بنادیں گے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کا بھلا چاہتے ہیں تو اُن پر بہترین حکام و امراء کا تسلط فرماتے ہیں، اور جب کسی قوم کا بُرا چاہتے ہیں تو ان پر بدترین حکام و سلاطین کو مسلط کردیتے ہیں (تفسیر بحر محیط)

تفسیر روح المعانی میں ہے کہ فقہاء نے اس آیت سے اس پر استدلال کیا ہے کہ جب رعیت اور عوام اللہ تعالیٰ سے منحرف ہوکر ظلم و جور میں مبتلا ہوجاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اُن پر ظالم حکام مسلط کرکے ان کے ہاتھوں ان کو سزا دلواتے ہیں۔

اور ابن کثیرؒ نے بروایت عبداللہ بن مسعودؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان نقل کیا ہے کہ مَنْ اَعَانَ ظَالِمًا سَلَّطَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ " یعنی جو شخص کسی ظالم کے ظلم میں اس کی مدد کرتا ہو تو اللہ تعالیٰ اسی ظالم کو اس کے ستانے کے لئے اس پر مسلط کردیتے ہیں، اور اسی کے ہاتھ سے اس کو سزا دلواتے ہیں ۔

دوسری آیت میں ایک سوال و جواب کا ذکر ہے جو محشر میں جنات اور انسانوں کو مخاطب کرکے کیا جائے گا، کہ تم جو کفر اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں مبتلا ہوئے اس کا کیا سبب ہوا؟ کیا تمہارے پاس ہمارے رسول نہیں پہنچے جو تمہاری قوم میں سے تھے، جو میری آیات تم کو پڑھ پڑھ کر سناتے اور آج کے دن کی حاضری اور حساب سے ڈراتے تھے؟ اس کے جواب میں ان سب کی طرف سے رسولوں کے آنے اور پیغام حق سنانے کا اور اس کے باوجود کفر و نافرمانی میں مبتلا ہونے کا اقرار ذکر کیا گیا ہے، اور ان کی طرف سے کوئی وجہ اور سبب اس غلط کاری کا ذکر نہیں کیا گیا، بلکہ حق تعالیٰ نے ہی اس کی وجہ یہ بتلائی ہے کہ وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا، یعنی ان لوگوں کو دنیا کی زندگی اور لذتوں نے دھوکہ میں ڈال دیا، کہ وہ اسی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے، جو درحقیقت کچھ نہ تھا، اور انجام و عاقبت سے غافل ہوگئے، بقول اکبر مرحوم ؎

تھی فقط غفلت ہی غفلت عیش کا دن کچھ نہ تھا
ہم اسے سب کچھ سمجھتے تھے وہ لیکن کچھ نہ تھا

اس آیت میں ایک بات تو یہ قابلِ غور ہو کہ بعض دوسری آیات میں تو یہ مذکور ہو کہ مشرکین سے جب محشر میں ان کے کفر و شرک کے متعلق سوال ہوگا تو وہ اپنے جرم سے مُکر جائیں گے، اور ربّ الارباب کے دربار میں قسم کھا کر یہ جھوٹ بولیں گے کہ وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ، یعنی قسم

ہے ہمارے پروردگار اللہ تعالیٰ کی ہم مشرک ہرگز نہ تھے" اور اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے کفر و شرک کا ندامت کے ساتھ اقرار کرلیں گے، ان دونوں میں بظاہر تعارض اور اختلاف معلوم ہوتا ہے، مگر دوسری آیات میں اس کی تشریح و توضیح اس طرح موجود ہے کہ ابتداء میں جب ان سے سوال ہوگا تو مکر جائیں گے، مگر اُس وقت اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے ان کی زبانیں بند کردیں گے، ہاتھوں پیروں اور دوسرے اعضاء سے گواہی لیں گے، اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ سے انکو گویائی عطا ہوگی، اور وہ صاف صاف اس کے سارے اعمال کا کچا چٹھا بیان کردیں گے، اور اس وقت جن و انس کو یہ معلوم ہوگا کہ ہمارے ہاتھ پاؤں اور کان اور زبان سب قدرت کے کارخانہ کی خفیہ پولیس کے افراد تھے، جنھوں نے سارے معاملات اور حالات کی بھی اور صحیح شہادت دیدی، تو اب ان کو انکار کرنے کی کوئی گنجائش نہ رہے گی، اس وقت یہ سب لوگ صاف صاف اعترافِ جرم کرلیں گے۔

کیا جنات میں بھی رسول ہوتے ہیں

دوسری بات اس جگہ قابلِ غور یہ ہے کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے جنات اور انسانوں کی دونوں جماعتوں کو خطاب کرکے یہ فرمایا ہے کہ کیا ہمارے رسول تمہارے پاس نہیں پہونچے جو تمہاری ہی قوم سے تھے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جس طرح انسانوں کے رسول انسان اور بشر بھیجے گئے ہیں اسی طرح جنات کے رسول جنات کی قوم سے بھیجے گئے ہیں۔

اس مسئلہ میں علماء تفسیر و حدیث کے اقوال مختلف ہیں، بعض کا کہنا یہ ہے کہ رسول اور نبی صرف انسان ہی ہوئے اور ہوتے چلے آئے ہیں، جنات کی قوم میں سے کوئی شخص رسول بلاواسطہ نہیں ہوا، بلکہ ایسا ہوا ہے کہ انسانی رسول اور پیغمبر کا کلام اپنی قوم کو پہونچانے کے لئے جنات کی قوم میں کچھ لوگ ہوئے ہیں جو درحقیقت رسولوں کے قاصد اور پیغامبر ہوتے تھے، مجازی طور پر ان کو بھی رسول کہہ دیا جاتا ہے، ان حضرات کا استدلال قرآن مجید کی اُن آیات سے ہو جن میں جنات کے ایسے اقوال مذکور ہیں کہ انھوں نے نبی کا کلام یا قرآن سن کر اپنی قوم کو پہونچایا، مثلاً وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ، اور سورۂ جن کی آیت فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ، وغیرہ۔

لیکن ایک جماعت علماء اس آیت کے ظاہری معنی کے اعتبار سے اس کی بھی قائل ہے کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ہر گروہ کے رسول اسی گروہ میں سے ہوتے تھے، انسانوں کے مختلف طبقات میں انسانی رسول آتے تھے، اور جنات کے مختلف طبقات میں جنات ہی میں سے رسول ہوتے تھے، حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خصوصیت ہو کہ آپ کو سارے عالم کے انسانوں اور جنات کا واحد رسول بناکر بھیجا گیا اور وہ بھی کسی ایک زمانہ کیلئے نہیں بلکہ قیامت تک پیدا ہونے والے تمام جن و انس آپ کی اُمت ہیں، اور آپ ہی سب کے رسول و پیغمبر ہیں۔

ہندوؤں کے اوتار بھی عموماً جنات ہیں ان میں کسی رسول نبی ہونے کا احتمال

ائمہ تفسیر میں سے کلبیؒ اور مجاہدؒ وغیرہ نے

اسی قول کو اختیار کیا ہے، اور قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے تفسیر مظہری میں اسی قول کو اختیار فرماتے ہوئے فرمایا ہے کہ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ آدم علیہ السلام سے پہلے جنات کے رسول جنات ہی کی قوم میں سے ہوتے تھے، اور جبکہ یہ ثابت ہو کہ زمین پر انسانوں سے ہزاروں سال پہلے سے جنات آباد تھے اور وہ بھی انسانوں کی طرح احکامِ شرع کے مکلف ہیں، تو ازروئے عقل و شرع ضروری ہے کہ ان میں اللہ تعالیٰ کے احکام پہونچانے والے رسول و پیغمبر ہوں۔

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہندوستان کے ہندو جو اپنی دھرم کی تاریخ ہزار ہا سال پہلے کی بتلاتے ہیں اور اپنے مقتدا، و بزرگ جن کو وہ اوتار کہتے ہیں اسی زمانہ کے لوگوں کو بتاتے ہیں، کچھ بعید نہیں کہ وہ یہی جنات کے رسول و پیغمبر ہوں اور انہی کی لائی ہوئی ہدایات کسی کتاب کی صورت میں جمع کی گئی ہوں، ہندوؤں کے اوتاروں کی جو تصویریں اور مورتیاں مندروں میں رکھی جاتی ہیں وہ بھی اسی انداز کی ہیں، کہ کسی کے کئی چہرے ہیں، کسی کے بہت سے ہاتھ پاؤں ہیں، کسی کے ہاتھی کی طرح سونڈ ہے، جو عام انسانی شکلوں سے بہت مختلف ہیں، اور جنات کا ایسی شکلوں میں متشکل ہونا کچھ مستبعد نہیں، اس لئے کچھ بعید نہیں کہ ان کے اوتار جنات کی قوم میں آئے ہوئے رسول یا ان کے نائب ہوں اور ان کی کتاب بھی ان کی ہدایات کا مجموعہ ہو، پھر رفتہ رفتہ جیسے دوسری کتابوں میں تحریف ہوگئی، اس میں بھی تحریف کر کے شرک و بت پرستی داخل کر دی گئی۔

اور بہرحال اگر وہ اصل کتاب اور رسول جن کی صحیح ہدایات بھی موجود ہوں تو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور رسالتِ عامہ کے بعد وہ بھی منسوخ اور ناقابلِ عمل ہی ہو جائیں اور مسخ و محرف ہونے کے بعد تو اس کا ناقابلِ عمل ہونا خود ہی واضح ہے۔

تیسری آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ انسانوں اور جنات میں رسول بھیجنا اللہ تعالیٰ کے عدل و انصاف اور رحمت کا تقاضا ہے کہ وہ کسی قوم پر ویسے ہی عذاب نہیں بھیج دیتے جب تک کہ ان کو پہلے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ بیدار نہ کر دیا جائے اور ہدایت کی روشنی ان کے لئے نہ بھیج دی جائے۔

چوتھی آیت کا مفہوم واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک انسانوں اور جنات میں ہر طبقہ کے لوگوں کے درجات مقرر ہیں، اور یہ درجات ان کے اعمال ہی کے مطابق رکھے گئے، ان میں سے ہر ایک کی جزاء و سزا انہی اعمال کے پیمانہ کے مطابق ہوگی۔

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ۚ إِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ

اور تیرا رب بے پروا ہے رحمت والا اگر چاہے تو تم کو لے جاوے اور تمہارے پیچھے قائم

مِنْ بَعْدِكُمْ مَا يَشَاءُ كَمَا أَنْشَأَكُمْ مِنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ آخَرِينَ ﴿۱۳۳﴾

کر دے جس کو چاہے جیسا کہ تم کو پیدا کیا اوروں کی اولاد سے،

إِنَّ مَا تُوعَدُونَ لَآتٍ ۙ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ ﴿۱۳۴﴾ قُلْ يَا قَوْمِ اعْمَلُوا

جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ ضرور آنیوالی ہے اور تم عاجز نہیں کر سکتے تو کہدے اے لوگو تم کام کرتے رہو

عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ ۖ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ مَنْ تَكُونُ لَهُ

اپنی جگہ پر میں بھی کام کرتا ہوں سو عنقریب جان لوگے تم کہ کس کو ملتا ہے عاقبت

عَاقِبَةُ الدَّارِ ۗ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ﴿۱۳۵﴾ وَجَعَلُوا لِلَّهِ مِمَّا

کا گھر بایقین بھلا نہ ہوگا ظالموں کا اور ٹھہراتے ہیں اللہ کا اس کی

ذَرَأَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْأَنْعَامِ نَصِيبًا فَقَالُوا هَٰذَا لِلَّهِ بِزَعْمِهِمْ

پیدا کی ہوئی کھیتی اور مواشی میں ایک حصہ پھر کہتے ہیں یہ حصہ اللہ کا ہے اپنے خیال میں

وَهَٰذَا لِشُرَكَائِنَا ۖ فَمَا كَانَ لِشُرَكَائِهِمْ فَلَا يَصِلُ إِلَى اللَّهِ ۖ وَمَا كَانَ

اور یہ ہمارے شریکوں کا ہے سو جو حصہ ان کے شریکوں کا ہے وہ تو نہیں پہنچتا اللہ کی طرف اور جو اللہ کا

لِلَّهِ فَهُوَ يَصِلُ إِلَىٰ شُرَكَائِهِمْ ۗ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ﴿۱۳۶﴾

ہے وہ پہنچ جاتا ہے ان کے شریکوں کی طرف کیا ہی برا انصاف کرتے ہیں

خلاصۂ تفسیر

اور آپ کا رب (رسولوں کو کچھ اس لئے نہیں بھیجتا کہ نعوذ باللہ وہ محتاج عبادت ہو وہ تو) بالکل غنی ہے (بلکہ اس لئے بھیجتا ہے کہ وہ) رحمت والا (بھی) ہے (اپنی رحمت سے رسولوں کو بھیجا تاکہ ان کے ذریعہ سے لوگوں کو منافع و مضار (نقصان دینی والی چیزیں) معلوم ہو جائیں، پھر منافع سے منتفع اور مضار سے محفوظ رہیں، سو اس میں بندوں ہی کا فائدہ ہے، اور باقی ان کا غنا تو ایسا ہے کہ) اگر وہ چاہے تو تم سب کو (دنیا سے دفعۃً) اٹھا لیوے اور تمہارے بعد جس (مخلوق) کو چاہے تمہاری جگہ (دنیا میں) آباد کر دے جیسا (اس کی نظیر پہلے سے موجود ہے کہ) تم کو (جو کہ اب موجود ہو) ایک دوسری قوم کی نسل سے پیدا کیا ہے (کہ ان کا کہیں پتہ نہیں اور تم ان کی جگہ موجود ہو، اور اسی طرح یہ سلسلہ چلا آرہا ہے، لیکن یہ سلسلہ تدریجاً قائم ہے، اگر ہم چاہیں دفعۃً بھی ایسا کر دیں، کیونکہ کسی کے ہونے نہ ہونے سے ہمارا کوئی کام اٹکا نہیں پڑا، پس اولاً رسل ہمارے احتیاج کی وجہ سے نہیں تمہاری احتیاج کی وجہ سے ہے، تم کو چاہئے کہ ان کی تصدیق اور ان کا اتباع کر کے سعادت حاصل کرو اور کفر و انکار کے ضرر سے بچو کیونکہ) جس چیز کا (رسولوں کی معرفت) تم سے

وعدہ کیا جاتا ہے (یعنی قیامت و عذاب) وہ بیشک آنے والی چیز ہے اور (اگر احتمال ہو کہ گو قیامت آوے مگر ہم کہیں بھاگ جائیں گے، ہاتھ نہ آئیں گے، جیسا دنیا میں حکام کا مجرم کبھی ایسا کرسکتا ہے، تو خوب سمجھ لو کہ) تم (خدا تعالیٰ کو) عاجز نہیں کرسکتے (کہ اس کے ہاتھ نہ آؤ، اور اگر باوجود اقامت دلائل تعیینِ حق کے کسی کو اس میں کلام ہو کہ کفر ہی کا طریقہ اچھا ہو اسلام کا بُرا ہے، پھر قیامت سے کیا اندیشہ تو ایسے لوگوں کے جواب میں) آپ (اخیر بات) یہ فرما دیجئے کہ اے میری قوم (تم جانو بہتر ہی) تم اپنی حالت پر عمل کرتے رہو میں بھی (اپنے طور پر) عمل کر رہا ہوں، سو اب جلدی تم کو معلوم ہوا جاتا ہے کہ اس عالم (کے اعمال) کا انجام کار (کس کے لئے نافع ہوگا ہمارے لئے یا تمہارے لئے اور) یہ یقینی بات ہے کہ حق تلفی کرنے والوں کو کبھی (انجام میں) فلاح نہ ہوگی (اور سب سے بڑھ کر اللہ کی حق تلفی ہے، اور یہ امر دلائل صحیحہ میں تھوڑا غور کرنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ طریقہ اسلام حق تلفی ہے یا طریقہ کفر، اور جو دلائل میں بھی غور نہ کرے اس سے اتنا کہہ دینا بس ہے فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ یعنی عنقریب تم اس عمل بد کا انجام جان لوگے) اور اللہ تعالیٰ نے جو کھیتی (وغیرہ) اور مواشی پیدا کئے ہیں ان (مشرک) لوگوں نے ان میں سے کچھ حصہ اللہ (کے نام) کا مقرر کیا (اور کچھ بتوں کے نام کا مقرر کیا حالانکہ پیدا کرنے میں کوئی شریک نہیں) اور بزعم خود کہتے ہیں کہ یہ تو اللہ کا ہے (جو کہ مہمانوں اور مساکین اور مسافر وغیرہ عام مصارف میں صرف ہوتا ہے) اور یہ ہمارے معبودوں کا ہے (جس کے مصارف خاص ہیں) پھر جو چیز ان کے معبودوں (کے نام) کی ہوتی ہے وہ تو اللہ (نام کے حصہ) کی طرف نہیں پہنچتی (بلکہ اتفاقاً مل جانے سے بھی الگ نکال لی جاتی ہے) اور جو چیز اللہ (کے نام) کی ہوتی ہے وہ ان کے معبودوں (کے نام کے حصہ) کی طرف پہنچ جاتی ہے، انھوں نے کیا بُری تجویز نکال رکھی ہے (کیونکہ اول تو اللہ کا پیدا کیا ہوا دوسرے کے نام کیوں جاوے، دوسرے پھر جتنا اللہ کا حصہ نکالا ہو اس میں سے بھی گھٹ جاوے، اور اگر غناء و احتیاج اس کا مبنیٰ ہے تو محتاج مان کر معبود سمجھنا اور زیادہ حماقت ہے)۔

معارف و مسائل

اس سے پہلی آیت میں یہ مذکور تھا کہ اللہ جل شانہ کا ہمیشہ سے یہ دستور رہا ہے کہ جن و بشر کی ہر قوم میں اپنے رسول اور اپنی ہدایات بھیجی ہیں، اور جب تک رسولوں کے ذریعہ ان کو پوری طرح متنبہ نہیں کردیا گیا اس وقت تک ان کے کفر و شرک اور معصیت و نافرمانی پر ان کو کبھی سزا نہیں دی۔

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ رسولوں اور آسمانی کتابوں کے تمام

سلسلے کچھ اس لئے نہیں بھیجے کہ رب العالمین کو ہماری عبادت اور اطاعت کی حاجت تھی، یا اس کا کوئی کام ہماری اطاعت پر موقوف تھا، نہیں وہ بالکل بے نیاز اور غنی ہے، مگر اس کے کمال استغناء اور بے نیازی کے ساتھ اس میں ایک صفت رحمت بھی ہے اور سارے عالم کے وجود میں لانے پھر باقی رکھنے اور ان کی ظاہری اور باطنی، موجودہ اور آئندہ تمام ضرورتوں کو بے مانگے پورا کرنے کا سبب بھی صفتِ رحمت ہے، ورنہ بیچارہ انسان اپنی ضروریات کو خود پیدا کرنے کے قابل تو کیا ہوتا اس کو تو اپنی تمام ضروریات کے مانگنے کا بھی سلیقہ نہیں، خصوصاً نعمتِ وجود جو عطا کی گئی ہے اس کا تو بے مانگے ملنا بالکل ہی واضح ہے کہ کسی انسان نے کہیں اپنے پیدا ہونے کی دعا نہیں مانگی، اور نہ وجود سے پہلے دعا مانگنے کا کوئی تصور ہوسکتا ہے، اسی طرح انسان کی تخلیق جن اعضاء سے کی گئی ہے آنکھ، کان، ہاتھ، پاؤں، دل، دماغ کیا یہ چیزیں کسی انسان نے مانگی تھیں؟ یا ہمیں اس کو مانگنے کا شعور و سلیقہ تھا؟ کچھ نہیں بلکہ

ما نبودیم و تقاضا ما نبود ؎ لطفِ تو ناگفتۂ ما می شنود

اللہ تعالیٰ سب سے بے نیاز ہے، تخلیقِ کائنات صرف اسکی رحمت کا نتیجہ ہے

بہرحال اس آیت میں وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ کے الفاظ سے رب الارباب کی بے نیازی بیان کرنے کے ساتھ ذُو الرَّحْمَةِ کا اضافہ کرکے یہ بتلا دیا کہ وہ اگرچہ تم سب سے بلکہ ساری کائنات سے بالکل مستغنی اور بے نیاز ہے لیکن بے نیازی کے ساتھ وہ ذوالرحمۃ یعنی رحمت والا بھی ہے۔

کسی انسان کو اللہ نے بے نیاز نہیں بنایا اس میں بڑی حکمت ہے، انسان بے نیاز ہوجائے تو ظلم کرتا ہے

اور یہ اسی ذات پاک کا کمال ہے ورنہ انسان کی عادت یہ ہے کہ اگر وہ دوسروں سے بے نیاز اور مستغنی ہوجائے تو اس کو دوسروں کے نفع نقصان اور رنج و راحت کی کوئی پروا نہیں رہتی، بلکہ اسی حالت میں وہ دوسروں پر ظلم و جور کے لئے آمادہ ہوجاتا ہے، قرآن کریم کی ایک آیت میں ارشاد ہے اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى، یعنی انسان جب اپنے آپ کو بے نیاز اور مستغنی پاتا ہے تو وہ سرکشی اور طغیانی پر آمادہ ہوجاتا ہے، اسی لئے حق جل شانہ نے انسان کو ایسی ضروریات میں جکڑ دیا ہے جو دوسروں کی امداد کے بغیر پوری ہی نہیں ہوسکتیں، بڑے سے بڑا بادشاہ اور حاکم نوکروں چاکروں اور چپراسیوں کا محتاج ہے، بڑے سے بڑا مالدار اور رئیس آخر مزدوروں کا محتاج ہے، صبح کو جس طرح ایک مزدور اور رکشا چلانے والا کچھ پیسے حاصل کرکے محتاجی دور کرنے کے لئے تلاش روزگار میں نکلتا ہے ٹھیک اسی طرح بڑے مالدار جن کو اغنیاء کہا جاتا ہے وہ مزدور اور رکشا اور گاڑی سواری کی تلاش میں نکلتے ہیں، قدرت نے سب کو محتاجی کی ایک زنجیر میں جکڑا ہوا ہے، ہر ایک دوسرے کا محتاج ہے، کسی کا کسی پر احسان نہیں اور یہ نہ ہوتا تو نہ کوئی مالدار کسی کو ایک پیسہ دیتا اور نہ کوئی مزدور کسی کا ذرا سا بوجھ اٹھاتا، یہ تو

صرف حق جل شانہٗ کی صفتِ کمال ہے کہ کامل استغناء اور بے نیازی کے باوجود وہ ذوالرحمۃ یعنی رحمت والا ہے، اس جگہ ذوالرحمۃ کے بجائے اگر رحمٰن یا رحیم کا لفظ لایا جاتا تب بھی مقصودِ کلام ادا ہو جاتا، لیکن غنی ہونے کے ساتھ صفتِ رحمت کے جوڑ کی خاص اہمیت ظاہر کرنے کے لئے عنوان ذوالرحمۃ کا اختیار فرمایا گیا، کہ وہ غنی اور مکمل بے نیاز ہونے کے باوجود صفتِ رحمت بھی مکمل رکھتا ہے، اور یہی صفت رسولوں اور کتابوں کے بھیجنے کا اصل سبب ہے۔

اس کے بعد یہ بھی بتلا دیا کہ جس طرح اس کی رحمت عام اور تام ہے اسی طرح اس کی قدرت ہر چیز اور ہر کام پر حاوی ہے، اگر وہ چاہے تو تم سب کو ایک آن میں فنا کر سکتا ہے، اور ساری مخلوق کے فنا کر دینے سے بھی اس کے کارخانۂ قدرت میں ادنیٰ سا فرق نہیں آتا، پھر اگر وہ چاہے تو موجودہ ساری کائنات کو فنا کر کے ان کی جگہ دوسری مخلوق اسی طرح اسی آن میں پیدا کر کے کھڑی کر دے، جس کی ایک نظیر انسان کے ہر دور میں اس کے سامنے رہتی ہے، کہ آج جو کروڑوں انسان زمین کے چپہ چپہ پر آباد اور زندگی کے تمام شعبوں کے مختلف کاروبار کو چلا رہے ہیں، اگر اب سے ایک سو سال پہلے کی طرف غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس وقت بھی یہ دنیا اسی طرح آباد تھی، اور سب کام چل رہے تھے، مگر موجودہ آباد کرنے والوں اور کام چلانے والوں میں سے کوئی نہ تھا، ایک دوسری قوم تھی جو آج زیرِ زمیں ہے، اور جس کا آج نام و نشان بھی نہیں ملتا، اور موجودہ دنیا اسی پہلی قوم کی نسل سے پیدا کی گئی ہے، ارشاد ہے:۔

اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ، یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہیں تو تم سب کو لے جائیں، لے جانے سے مراد ایسا فنا کر دینا ہے کہ نام و نشان تک گم ہو جائے، اور اسی لئے یہاں ہلاک کرنے یا مار دینے کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ یہ جانا ارشاد فرمایا جس میں فنا محض اور بے نام و نشان کر دینے کی طرف اشارہ ہے۔

اس آیت میں اللہ جل شانہٗ کے غنی اور بے نیاز ہونے کا، پھر صاحبِ رحمت ہونے کا، اور پھر قدرتِ کاملہ کے مالک ہونے کا بیان کرنے کے بعد دوسری آیت میں نافرمانوں اور حکم نہ ماننے والوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ:

اِنَّ مَا تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ ۙ وَّمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ، یعنی اللہ تعالیٰ نے تم کو جس عذاب سے ڈرایا ہے وہ ضرور آنے والا ہے، اور تم سب مل کر بھی خدائی عذاب کو نہیں ٹال سکتے۔

تیسری آیت میں پھر ان کو غفلت سے چونکانے کا ایک دوسرا طریقہ اختیار کر کے ارشاد فرمایا:

قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ جس میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے کہ آپ ان

اہلِ مکہ سے کہہ دیجئے کہ اے میری قوم اگر تم میری بات نہیں مانتے تو تمہیں خبردار ہو نہ مانو اور اپنی حالت پر اپنے عقیدہ اور عناد کے مطابق عمل کرتے رہو میں بھی اپنے عقیدہ کے مطابق عمل کرتا رہوں گا، میرا اس میں کوئی نقصان نہیں، مگر عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ دارِ آخرت کی نجات اور فلاح کس کو حاصل ہوتی ہے، یہ خوب سمجھ لو کہ ظالم یعنی حق تلفی کرنے والے کبھی فلاح نہیں پایا کرتے۔

اور امام تفسیر ابن کثیر نے اس آیت کی تفسیر میں اس طرف بھی اشارہ فرمایا کہ اس جگہ آیت میں مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ فرمایا ہے عَاقِبَةُ الدَّارِ الْاٰخِرَةِ نہیں فرمایا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دارِ آخرت سے پہلے دارِ دنیا میں بھی انجام کار فلاح و کامیابی اللہ کے نیک بندوں ہی کو حاصل ہوتی ہے، جیسا کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے حالات اس پر شاہد ہیں کہ تھوڑے ہی عرصہ میں تمام قوت و اقتدار والے مخالف ان کے سامنے ذلیل ہوئے، ان کے ملک ان کے ہاتھوں پر فتح ہوئے، خود عہدِ رسالت میں تمام جزیرۂ عرب آپ کے زیرِ نگین آ گیا، یمن اور بحرین سے لیکر حدودِ شام تک آپ کی حکومت پھیل گئی، پھر آپ کے خلفاء اور صحابۂ کرام کے ہاتھوں تقریباً پوری دنیا اسلام کے جھنڈے تلے آ گئی، اور اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ پورا ہوا كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ، یعنی اللہ نے لکھ دیا ہے کہ میں غالب آؤں گا اور میرے رسول غالب آئیں گے اور دوسری آیت میں ارشاد ہے اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ، یعنی ہم اپنے رسولوں کی مدد کریں گے، اور ان لوگوں کی جو ایمان لائے، اس دنیا میں بھی اور اس دن میں بھی جب کہ اعمال کے حساب پر گواہی دینے والے گواہی پر کھڑے ہوں گے، یعنی قیامت کے دن۔

چوتھی آیت میں مشرکینِ عرب کی ایک خاص گمراہی اور غلط کاری پر تنبیہ فرمائی گئی ہے، عرب کی عادت یہ تھی کہ کھیتی اور باغات سے نیز تجارتوں سے جو کچھ پیداوار ہوتی تھی، اس میں سے ایک حصہ اللہ کے لئے اور ایک حصہ اپنے بتوں کے لئے نکالا کرتے تھے، اللہ کے نام کا حصہ غرباء و فقراء و مساکین پر خرچ کرتے اور بتوں کے نام کا حصہ بیت خانہ کے پجاریوں اور نگہبانوں پر صرف کیا کرتے تھے۔

اوّل تو یہی ظلم کچھ کم نہ تھا کہ ساری چیزیں پیدا تو خدا تعالیٰ نے فرمائی اور ہر چیز کی پیداوار اس نے عطا فرمائی، پھر اس کی دی ہوئی چیزوں میں بتوں کو شریک کر دیا، اس پر مزید ستم بر ستم یہ تھا کہ اگر کبھی پیداوار میں کچھ کمی آ جائے تو اس کمی کو اللہ کے حصہ پر یہ کہہ کر ڈال دیتے کہ اللہ تعالیٰ تو مستغنی ہے وہ ہماری چیزوں کا محتاج نہیں، اور بتوں کا حصہ بھی پورا کر لیتے، اور خود اپنے استعمال کا حصہ بھی، اور کبھی ایسا ہوتا کہ بتوں کے حصہ میں سے یا اپنے حصہ میں سے کوئی چیز اللہ کے حصہ

میں پڑجاتی تو اس کو حساب پورا کرنے کے لئے اس میں سے نکال لیتے تھے اور اگر کبھی معاملہ برعکس ہوجاتا کہ اللہ کے حصہ میں سے کوئی چیز اپنے حصہ یا بتوں کے حصہ میں پڑجائے تو اس کو وہیں رہنے دیتے اور یہ کہتے کہ اللہ تعالیٰ تو غنی ہے اس کے حصہ میں سے کچھ کم بھی ہوجائے تو حرج نہیں، قرآن کریم نے ان کی اس گمراہی اور غلط کاری کو ذکر کر کے فرمایا سَآءَ مَا یَحۡکُمُوۡنَ، یعنی ان لوگوں کا یہ فیصلہ کس قدر بُرا اور بھونڈا ہے کہ جس نے ان کو اور ان کی ساری چیزوں کو پیدا کیا، اول تو اس کے ساتھ دوسروں کو شریک کر دیا، پھر اس کے حصہ کو بھی دوسری طرف مختلف بہانوں سے منتقل کر دیا۔

کافروں کی اس تنبیہ میں مسلمانوں کے لئے عبرت

یہ تو مشرکین عرب کی ایک گمراہی اور غلط روش پر تنبیہ کی گئی ہے، اس کے ساتھ اس کے ضمن میں ان مسلمانوں کے لئے بھی ایک تازیانۂ عبرت ہے جو اللہ کی دی ہوئی زندگانی اور اس کے بخشے ہوئے اعضاء و جوارح کی پوری توانائی کو مختلف حصوں میں بانٹتے ہیں عمر اور وقت کا ایک حصہ اللہ اور اس کی عبادت کے لئے مخصوص کرتے ہیں، حالانکہ حق تو اس کا یہ تھا کہ عمر کے سارے اوقات اور لمحات اسی کی عبادت اور طاعت کے لئے وقف ہوتے، انسانی ضرورتوں اور مجبوریوں کے لئے اس میں سے کوئی وقت اپنے لئے بھی نکال لیتے، اور حق تو یہ ہے کہ پھر بھی اس کا حق شکر ادا نہ ہوتا، مگر یہاں تو حالت ہماری یہ ہے کہ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں سے اگر ہم کوئی وقت اللہ کی یاد اور عبادت کے لئے مقرر بھی کر لیتے ہیں تو جب کوئی ضرورت پیش آتی ہے اس میں نہ اپنے کاروبار میں کوئی حرج ڈالا جاتا ہے، نہ آرام کے اوقات میں، سارا نزلہ اس وقت پر پڑتا ہے جو نماز، تلاوت یا عبادت کے لئے مقرر کیا تھا، کوئی کام پیش آوے، یا بیماری یا کوئی دوسری ضرورت تو سب سے پہلے اس کا اثر اسی وقت پر پڑتا ہے جو ہم نے ذکر اللہ یا عبادت کے لئے مخصوص کیا تھا، یہ کیسا غلط فیصلہ اور کتنی ناشکری اور حق تلفی ہے، اللہ تعالیٰ ہم کو اور سب مسلمانوں کو اس سے محفوظ رکھیں۔

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ

اور اسی طرح مزین کر دیا بہت سے مشرکوں کی نگاہ میں ان کی اولاد کے قتل کو

شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ۭ وَلَوْ

اُن کے شریکوں نے تاکہ ان کو ہلاک کریں اور رَلا مِلا دیں ان پر ان کے دین کو اور

شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَقَالُوْا هٰذِهٖٓ

اللہ چاہتا تو وہ یہ کام نہ کرتے سو چھوڑ دے وہ جانیں اور ان کا جھوٹ اور کہتے ہیں کہ یہ

اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ ڰ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ

مواشی اور کھیتی ممنوع ہے اس کو کوئی نہ کھاوے مگر جس کو ہم چاہیں ان کے خیال کے موافق

وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا

اور بعض مواشی کی پیٹھ پر چڑھنا حرام کیا اور بعض مواشی کے ذبح کے وقت نام نہیں لیتے اللہ کا

افْتِرَآءً عَلَيْهِ ۭ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ وَقَالُوْا مَا فِيْ

بہتان باندھ کر عنقریب وہ سزا دے گا اُن کو اس جھوٹ کی اور کہتے ہیں جو بچہ ان مواشی

بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓي اَزْوَاجِنَا ۚ

کے پیٹ میں ہو اس کو تو خاص ہمارے مرد ہی کھاویں اور وہ حرام ہے ہماری عورتوں پر

وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ ۭ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ ۭ

اور جو بچہ مردہ ہو تو اس کے کھانے میں سب برابر ہیں وہ سزا دے گا ان کو ان کی تقریروں کی،

اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۳۹﴾ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا

وہ حکمت والا جاننے والا ہے بیشک خراب ہوئے جنھوں نے قتل کیا اپنی اولاد کو نادانی سے

بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَي اللّٰهِ ۭ قَدْ

بغیر سمجھے اور حرام ٹھہرالیا اس رزق کو جو اللہ نے ان کو دیا بہتان باندھ کر اللہ پر بیشک

ع ۱۶ ۱۱ ۳ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۱۴۰﴾

وہ گمراہ ہوئے اور نہ آئے سیدھی راہ پر

ربط آیات

پچھلی آیتوں میں مشرکین کے عقائد باطلہ مشرکیہ کفریہ کا بیان تھا، ان آیات میں ان کی عملی غلطیوں اور جاہلانہ رسموں کا ذکر ہے، جن رسوم جاہلیت کا ذکر ان آیات میں آیا ہے وہ یہ ہیں: ۱۔ اول غلہ اور پھل میں سے کچھ حصہ اللہ کے نام کا نکالتے ہیں اور کچھ بتوں اور جنات کے نام کا، پھر اگر اتفاق سے اللہ کے حصہ میں سے کچھ حصہ بتوں کے حصہ میں مل جاتا تو اس کو اسی طرح ملا رہنے دیتے تھے، اور معاملہ برعکس ہوتا تو اس کو نکال کر پھر بتوں کے حصہ کو پورا کر دیتے تھے اور بہانہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ تو غنی ہے اس کا حصہ کم ہوجانے سے اس کا کوئی ضرر نہیں، اور شرکاء محتاج ہیں، ان کا حصہ نہ گھٹنا چاہئے، اس رسم بد کا بیان آیاتِ مذکورہ سے پہلی آیت میں آچکا۔

دوسری رسم یہ تھی کہ بحیرہ، سائبہ جانوروں کو بتوں کے نام پر چھوڑتے اور یہ کہتے تھے کہ یہ کام اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے ہے، اس میں بھی بتوں کا حصہ یہ تھا کہ عبادت اُن کی تھی، اور اللہ کا حصہ یہ ہوا کہ اس کو خوشنودی اللہ کی سمجھتے تھے۔

تیسری رسم اپنی دختری اولاد کو قتل کر ڈالنے کی تھی، چوتھی رسم کچھ کھیت بتوں کے نام

وقف کر دیتے اور کہتے کہ اس کا اصل مصرف فقط مرد ہیں، عورتوں کو اس میں سے کچھ دینا نہ دینا ہماری مرضی پر ہے، ان کو مطالبہ کا حق نہیں۔

پانچویں رسم، اسی طرح کا عمل مواشی جانوروں میں کرتے تھے کہ بعض کو مردوں کے لئے مخصوص قرار دیتے تھے۔

چھٹی رسم، جن چوپایہ جانوروں کو بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تو ان پر سواری اور بار برداری کو حرام سمجھتے تھے۔

ساتویں رسم، بعض چوپایہ جانور مخصوص تھے جن پر کسی موقع میں بھی اللہ کا نام نہ لیتے تھے نہ دودھ نکالنے کے وقت نہ سوار ہوتے وقت، نہ ذبح کرنے کے وقت۔

آٹھویں رسم یہ تھی کہ جن جانوروں کا نام بحیرہ یا سائبہ رکھ کر بتوں کے نام پر چھوڑتے ان کے ذبح کے وقت اگر بچہ پیٹ سے زندہ نکلتا تو اس کو بھی ذبح کر لیتے، مگر اس کو صرف مردوں کے لئے حلال عورتوں کے لئے حرام سمجھتے تھے اور اگر بچہ مردہ نکلا تو وہ سب کے لئے حلال ہوتا تھا۔

نویں رسم، بعض جانوروں کا دودھ بھی مردوں کے لئے حلال عورتوں کیلئے حرام سمجھتے تھے۔

دسویں رسم، بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حامی چار قسم کے جانوروں کی تعظیم کو عبادت سمجھتے تھے۔

(یہ سب روایات درمنثور اور روح المعانی میں حضرت ابن عباس، مجاہد، ابن زید اور سدی سے تخریج ابن منذر، ابن ابی حاتم، ابن ابی شیبہ، ابن حمید منقول ہیں) (از بیان القرآن)

خلاصۂ تفسیر

اسی طرح بہت سے مشرکین کے خیال میں ان کے معبودوں (شیاطین) نے اپنی اولاد کے قتل کرنے کو مستحسن بنا رکھا ہے (جیسا کہ جاہلیت میں لڑکیوں کو قتل یا زندہ درگور کر دینے کی رسم تھی) تاکہ (اس فعل قبیح کے ارتکاب سے) وہ (شیاطین) ان (مشرکین) کو (بوجہ استحقاق عذاب کے) برباد کریں اور تاکہ ان کے طریقہ کو مخبوط کر دیں (کہ ہمیشہ غلطی میں پھنسے رہیں، اور آپ انکی ان حرکات شنیعہ سے مغموم نہ ہوں، ... کیونکہ) اگر اللہ تعالیٰ کو انکا بھلا منظور ہوتا تو یہ ایسا کام نہ کرتے، تو آپ ان کو اور جو کچھ یہ غلط باتیں بنا رہے ہیں (کہ ہمارا یہ فعل بہت اچھا ہے) یوں ہی رہنے دیجئے، (کچھ فکر نہ کیجئے ہم آپ سمجھ لیں گے) اور وہ اپنے خیال (باطل) پر یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ (مخصوص) مواشی ہیں، اور (مخصوص) کھیت ہیں جن کا استعمال ہر شخص کو جائز نہیں ان کو کوئی نہیں کھا سکتا سوائے ان کے جنکو ہم چاہیں (جیسا رسم چہارم و پنجم میں مذکور ہوا) اور (یوں کہتے ہیں کہ یہ مخصوص) مواشی ہیں جن پر سواری یا بار برداری حرام کر دی گئی ہے (جیسا رسم ششم میں مذکور ہوا) اور (یوں کہتے ہیں کہ یہ

مخصوص) مواشی ہیں جن پر (اللہ کا نام نہیں لینا چاہئے، چنانچہ اسی اعتقاد کی وجہ سے اُن پر) یہ لوگ اللہ ۳۰
کا نام نہیں لیتے (جیسا رسم ہفتم میں مذکور ہوا اور یہ سب باتیں) محض اللہ پر افتراء باندھنے کے طور پر (کہتے ہیں، افتراء اس لئے کہ وہ ان امور کو موجب خوشنودی حق تعالیٰ سمجھتے تھے) ابھی اللہ تعالیٰ ان کو ان کے افتراء کی سزا دیتا ہے (ابھی اس لئے کہا کہ قیامت جو کہ آنے والی ہے دور نہیں، اور کچھ سزا تو مرنے ہی شروع ہو جائے گی) اور وہ (یوں بھی) کہتے ہیں کہ جو چیز ان مواشی کے پیٹ میں (سے نکلتی) ہے (مثلاً دودھ یا بچہ) وہ خالص ہمارے مردوں کے لئے (حلال) ہے اور ہماری عورتوں پر حرام ہے اور اگر وہ (پیٹ کا نکلا ہوا بچہ) مردہ ہو تو اس (سے منتفع ہونے کے جواز) میں (مرد و عورت) سب برابر ہیں (جیسا رسم ہشتم و نہم میں مذکور ہوا) ابھی اللہ تعالیٰ ان کو ان کی (اس غلط بیانی کی سزا دیئے دیتا ہے (غلط بیانی کی وہی تقریر ہے جو افتراء کی گذری، اور اب تک جو سزا نہیں دی تو وجہ یہ ہے کہ) بلاشبہ وہ حکمت والا ہے (بعض حکمتوں سے مہلت دے رکھی ہے، اور ابھی سزا نہ دینے سے کوئی یوں نہ سمجھے کہ ان کو خبر نہیں، کیونکہ) وہ بڑا علم والا ہے (اس کو سب خبر ہے، آگے بطور خلاصہ اور انجام کے فرماتے ہیں کہ) واقعی خرابی میں پڑ گئے وہ لوگ جنھوں نے (ان افعال مذکورہ کو طریقہ بنا لیا کہ) اپنی اولاد کو محض براہ حماقت بلا کسی (معقول و مقبول) سند کے قتل کر ڈالا اور جو (حلال) چیزیں ان کو اللہ تعالیٰ نے کھانے پینے کو دی تھیں ان کو (اعتقاداً یا عملاً) حرام کر لیا (جیسا اوپر کے رسوم اور رسم دہم میں کہ منشاء سب کا متحد ہے مذکور ہوا اور یہ مجموعہ) محض اللہ پر افتراء باندھنے کے طور پر (ہوا، جیسا کہ اوپر قتل اولاد میں یفترون اور تحریم انعام میں افتراء جدا جدا بھی آچکا ہے) بیشک یہ لوگ گمراہی میں پڑ گئے اور (یہ گمراہی جدید نہیں بلکہ قدیم ہے، کیونکہ پہلے بھی) کبھی راہ پر چلنے والے نہیں ہوئے (پس قتلوا میں خلاصہ طریق کا اور خسر اور ضلّوا میں اس کی تاکید اور خسر اور خسروا میں خلاصۂ انجام بد کا کہ عذاب ہے ذکر کیا گیا)

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ

اور اسی نے پیدا کئے باغ جو ٹٹیوں پر چڑھائے جاتے ہیں اور جو ٹٹیوں پر نہیں چڑھائے جاتے اور کھجور کے درخت

وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَيْرَ

اور کھیتی کہ مختلف ہیں ان کے پھل اور پیدا کیا زیتون کو اور انار کو ایک دوسرے کے مشابہ اور جدا

مُتَشَابِهٍ ۭ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ڮ

جدا بھی، کھاؤ ان کے پھل میں سے جس وقت پھل لاویں اور ادا کرو اس کا حق جس دن اس کو کاٹو

وَلَا تُسْرِفُوْا ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۱۴۱﴾ وَمِنَ الْاَنْعَامِ

اور بیجا خرچ نہ کرو، اس کو خوش نہیں آتے بیجا خرچ کرنیوالے اور پیدا کئے مواشی میں بوجھ

حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا ۭ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ

اٹھانیوالے اور زمین سے لگے ہوئے کھاؤ اللہ کے رزق میں سے اور مت چلو شیطان کے

الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۴۲﴾

قدموں پر وہ تمہارا دشمن ہے صریح

خلاصۂ تفسیر

اور وہی (اللہ پاک) ہے جس نے باغات پیدا کئے وہ بھی جو ٹٹیوں پر چڑھائے جاتے ہیں (جیسے انگور) اور وہ بھی جو ٹٹیوں پر نہیں چڑھائے جاتے (یا تو اس لئے کہ بیلدار نہیں جیسے تنہ دار درخت، یا باوجود بیلدار ہونے کے عادت نہیں، جیسے خربزہ، تربوز وغیرہ) اور کھجور کے درخت اور کھیتی (بھی اس نے پیدا کئے) جن میں کھانے کی چیزیں مختلف طور کی (حاصل) ہوتی ہیں اور زیتون اور انار (بھی اسی نے پیدا کئے) جو (انار، انار) باہم (اور زیتون زیتون باہم رنگ و مزہ و شکل و مقدار میں سے بعض صفات میں کبھی) ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں اور (کبھی) ایک دوسرے کے مشابہ نہیں بھی ہوتے (اور اللہ نے ان چیزوں کو پیدا کرکے اجازت دی ہے کہ) ان سب کی پیداوار کھاؤ (خواہ اسی وقت سے سہی) جب وہ نکل آوے (اور پکنے بھی نہ پاوے) اور (البتہ اس کے ساتھ اتنا ضرور ہو کہ) اس میں جو حق (شرع سے) واجب ہو (یعنی خیرات) وہ اس کے کاٹنے (توڑنے) کے دن (مسکینوں کو) دیا کرو اور (اس دینے میں بھی) حد (اذن شرعی) سے مت گذرو (یقیناً وہ (یعنی اللہ تعالیٰ) حد (اذن شرعی) سے گذرنے والوں کو ناپسند کرتے ہیں، اور (جس طرح باغ اور کھیت اللہ نے پیدا کئے ہیں، اسی طرح حیوانات بھی چنانچہ) مواشی میں اونچے قد کے (بھی) اور چھوٹے قد کے (بھی اسی نے پیدا کئے، اور ان کے بارہ میں بھی مثل باغ اور کھیت کے اجازت دی کہ) جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تم کو دیا ہے (اور شرع سے حلال کیا ہے اس کو) کھاؤ اور (اپنی طرف سے تحریم کے احکام تراش کر) شیطان کے قدم بقدم مت چلو، بلاشک وہ تمہارا صریح دشمن ہے (کہ تم کو باوجود وضوح دلائل حق کے گمراہ کر رہا ہے)

معارف و مسائل

پچھلی آیتوں میں مشرکین مکہ کی اس گمراہی کا ذکر تھا کہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کئے ہوئے جانوروں اور اس کی عطا کی ہوئی نعمتوں میں ان ظالموں نے اپنے خود تراشیدہ بے جان بے شعور بتوں کو اللہ تعالیٰ کا ساجھی قرار دے کر جو چیز وہ بطور عبادت یا صدقہ خیرات کے نکالتے ہیں ان میں ایک حصہ اللہ تعالیٰ کا اور دوسرا حصہ بتوں کا رکھتے ہیں، پھر اللہ کے حصہ کو بھی مختلف حیلوں حوالوں سے بتوں کے حصہ میں ڈالتے ہیں، اسی طرح کی اور بہت سی جاہلانہ رسموں کو شرعی قانون کی حیثیت دے رکھی ہے۔

مذکورہ آیتوں میں سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے نباتات اور درختوں کی مختلف قسمیں اور ان کے فوائد و ثمرات کی تخلیق میں اپنی قدرت کاملہ کے حیرت انگیز کمالات کا ذکر فرمایا اور دوسری آیت میں اسی طرح جانوروں اور مویشی کی مختلف قسموں کی پیدائش کا ذکر فرما کر ان کی گمراہی پر متنبہ فرمایا کہ ان بے بصیرت لوگوں نے کیسے قادر مطلق علیم و خبیر کے ساتھ کیسے بے خبر بے شعور بے جان اور بے لبس چیزوں کو اس کا شریک و ساجھی بنا ڈالا ہے۔

اور پھر ان کو صراط مستقیم اور صحیح راہ عمل کی طرف ہدایت فرمائی، کہ جب ان چیزوں کے پیدا کرنے اور تم کو عطا کرنے میں کوئی سہیم و شریک نہیں تو عبادت میں ان کو شریک ٹھہرانا انتہائی کفران نعمت اور ظلم ہے، جس نے یہ چیزیں پیدا کرکے تم کو عطا فرمائیں اور تمہارے لئے ایسا مسخر کر دیا کہ جس طرح چاہو ان کو استعمال کر سکو، اور پھر ان سب چیزوں کو تمہارے لئے حلال کر دیا، تمہارا فرض ہے کہ اس کی ان نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کے وقت اس کے حق شکر کو یاد رکھو، اور اداکرو شیطانی خیالات اور جاہلانہ رسموں کو اپنا دین نہ بناؤ۔

پہلی آیت میں اَنْشَاَ کے معنی پیدا کیا اور مَّعْرُوْشٰتٍ، عرش سے بنا ہے، جس کے معنی اٹھانے کے اور بلند کرنے کے ہیں، مراد معروشات سے درختوں کی وہ بیلیں ہیں جو ٹٹیوں پر چڑھائی جاتی ہیں، جیسے انگور اور بعض ترکاریاں، اور اس کے بالمقابل غَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ میں وہ سب درخت شامل ہیں جن کی بیلیں اوپر نہیں چڑھائی جاتیں، خواہ وہ تنہ دار درخت ہوں جن کی بیل ہی نہیں یا بیل دار ہوں مگر ان کی بیلیں زمین ہی پر پھیلتی ہیں اوپر نہیں چڑھائی جاتیں، جیسے تربوز، خربزہ وغیرہ، اور نَخْلَ کے معنی کھجور کا درخت، اور زَرْعَ ہر قسم کی کھیتی، اور زَيْتُوْنَ درخت زیتون کو بھی کہتے ہیں اس کے پھل کو بھی، اور رُمَّانَ انار کو کہا جاتا ہے۔

ان آیات میں حق تعالیٰ نے اول تو باغات میں پیدا ہونے والے درختوں کی دو قسمیں بیان فرمائیں، ایک وہ جن کی بیلیں اوپر چڑھائی جاتی ہیں، دوسری وہ جن کی بیلیں چڑھائی نہیں جاتیں،

اس میں اپنی حکمت بالغہ اور رموز قدرت کی طرف اشارہ ہے کہ ایک ہی مٹی اور ایک ہی پانی اور ایک ہی ہوا فضاء سے کیسے کیسے مختلف انداز کے پودے پیدا فرمائے، پھر ان کے پھلوں کی تیاری اور سبزی و شادابی اور ان میں رکھے ہوئے ہزاروں خواص و آثار کی رعایت سے کسی درخت کا مزاج ایسا کر دیا کہ جب تک بیل اوپر نہ چڑھے اول تو پھل آتا ہی نہیں، اور آ بھی جائے تو بڑھتا اور باقی نہیں رہتا، جیسے انگور وغیرہ، اور کسی کا مزاج ایسا بنا دیا کہ اس کی بیل کو اوپر چڑھانا بھی چاہو تو نہ چڑھے، اور چڑھ بھی جائے تو اس کا پھل بگڑ جائے جیسے خربوزہ تربوز وغیرہ، اور بعض درختوں کو مضبوط تنوں پر کھڑا کر کے اتنا اونچا لے گئے کہ آدمی کی صنعت و اختیار سے اتنا اونچا لے جانا عادۃً ممکن نہ تھا۔ اور درختوں کی یہ نیرنگی محض اتفاقی نہیں بلکہ بڑی حکمت کے ساتھ ان کے پھلوں کے مزاج کی رعایت سے ہے، بعض پھل زمین اور مٹی ہی میں بڑھتے اور پکتے ہیں، اور بعض کو مٹی لگنا خراب کر دیتا ہے، بعض کے لئے اونچی شاخوں پر لٹک کر مسلسل تازہ ہوا کھانا، آفتاب کی کرنوں اور ستاروں کی شعاعوں سے رنگ حاصل کرنا ضروری ہے، ہر ایک کے لئے قدرت نے اس کے مناسب انتظام فرما دیا، فتبارک اللہ احسن الخالقین۔

اس کے بعد خصوصی طور پر نخل اور زرع یعنی کھجور کے درخت اور کھیتی کا ذکر فرمایا، کھجور کا پھل عام طور پر تفریحاً کھایا جاتا ہے، اور بوقت ضرورت اس سے پوری غذا کا کام بھی لیا جاتا ہے اور کھیتی میں پیدا ہونے والی اجناس سے عموماً انسانوں کی غذا اور جانوروں کا چارہ حاصل کیا جاتا ہے، ان دونوں کو ذکر کرنے کے بعد فرمایا مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ، اس میں اُكُلُهٗ کی ضمیر زرع کی طرف بھی راجع ہو سکتی ہے اور نخل کی طرف بھی، اور حاصل دونوں کا یہ ہے کہ کھجوروں میں مختلف قسمیں اور ہر قسم کا مختلف ذائقہ ہے، اور کھیتی میں تو سیکڑوں قسمیں اور ہر قسم کے ذائقے اور فوائد مختلف ہیں، ایک ہی آب و ہوا ایک ہی زمین سے نکلنے والے پھلوں میں اتنا عظیم الشان تفاوت اور پھر ہر قسم کے فوائد اور خواص کا حیرت انگیز اختلاف اور تنوع ایک ادنیٰ بصیرت رکھنے والے انسان کو یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ ان کو پیدا کرنے والی کوئی ایسی مافوق الفہم ہستی ہے جس کے علم و حکمت کا اندازہ بھی انسان نہیں لگا سکتا۔

اس کے بعد دو چیزیں اور ذکر فرمائیں، زیتون اور رمان یعنی انار، زیتون کا پھل پھل بھی ہے ترکاری بھی، اور اس کا تیل سب تیلوں سے زیادہ صاف، شفاف اور نفیس ہونے کے ساتھ بے شمار فوائد و خواص پر مشتمل ہے، ہزاروں امراض کا بہترین علاج ہے، اسی طرح انار کے بے شمار فوائد و خواص ہیں، جن کو سب عوام و خواص جانتے ہیں، ان دونوں پھلوں کا ذکر کر کے فرمایا مُتَشَابِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ، یعنی ان میں سے ہر ایک کے پھل کچھ ایسے ہوتے ہیں جو رنگ اور ذائقہ کے اعتبار سے ملے جلے... ایک جیسے ہوتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں

جن کے رنگ اور ذائقے مختلف ہوتے ہیں، اور یہ بعض دانوں کا رنگ و مزہ اور مقداریں یکساں اور بعض کا مختلف ہونا انار میں بھی پایا جاتا ہے، زیتون میں بھی۔

ان تمام اقسام کے درختوں اور پھلوں کا ذکر فرما کر اس آیت میں انسان کو دو حکم دیئے گئے، پہلا حکم تو خود انسان کی خواہش اور نفس کے تقاضے کو پورا کرنے والا ہو، فرمایا كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ، یعنی ان درختوں اور کھیتوں کے پھلوں کو کھاؤ جب وہ پھل دار ہو جائیں، اس میں اشارہ فرما دیا کہ ان تمام انواع و اقسام کے درختوں کو پیدا کرنے سے پیدا کرنے والے مالک کی اپنی کوئی ضرورت پوری کرنا نہیں بلکہ تمہارے ہی فائدہ کے لئے پیدا کیا ہے، سو تمہیں اختیار ہے ان کو کھاؤ اور فائدہ اٹھاؤ، اِذَآ اَثْمَرَ فرما کر اس طرف اشارہ فرما دیا کہ درختوں کی شاخوں اور لکڑیوں سے پھل نکال لانا تمہارے تو بس کا کام نہیں، جب وہ پھل باذن اللہ نکل آئیں تو ان کے کھانے کا اختیار اسی وقت حاصل ہو گیا خواہ وہ ابھی پکے بھی نہ ہوں۔

زمین کا عشر

دوسرا حکم یہ دیا گیا وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ، آتوا کے معنی ہیں "لاؤ" یا "ادا کرو"، اور حصاد کہتے ہیں "کھیتی کٹنے یا پھلوں کے توڑنے کے وقت کو" اور حقّہٗ کی ضمیر ان کھانے کی چیزوں کی طرف عائد ہے جن کا ذکر اوپر آیا ہے، معنی یہ ہیں کہ ان سب چیزوں کو کھاؤ پیو استعمال کرو، مگر ایک بات یاد رکھو کہ کھیتی کاٹنے یا پھل توڑنے کے وقت اس کا حق بھی ادا کیا کرو، حق سے مراد غرباء و مساکین پر صدقہ کرنا ہے، جیسا کہ دوسری ایک آیت میں عام الفاظ سے ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ	"یعنی نیک بندوں کے اموال میں معین حق ہوتا ہے مانگنے والے اور نہ مانگنے والے فقراء و مساکین کا۔"

مراد اس صدقہ سے عام صدقہ خیرات ہے، یا وہ صدقہ جو زمین کی زکوٰۃ یا عشر کہلاتا ہے، اس میں ائمہ تفسیر صحابہ و تابعین کے دو قول ہیں، بعض حضرات نے پہلے قول کو اختیار فرمایا ہے اور وجہ یہ قرار دی ہے کہ یہ آیت مکی ہے، اور زکوٰۃ کا فریضہ ہجرت مدینہ طیبہ کے دو سال بعد عائد ہوا ہے، اس لئے یہاں حق سے مراد حق زکوٰۃ الارض نہیں ہو سکتا، اور بعض حضرات نے اس آیت کو مدنی آیات میں شمار فرمایا، اور حقّہٗ سے مراد زمین کی زکوٰۃ اور عشر کو قرار دیا۔

اور امام تفسیر ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں اور ابن عربی اندلسی نے احکام القرآن میں اس کا فیصلہ اس طرح فرمایا ہے کہ آیت خواہ مکی ہو یا مدنی، دونوں صورتوں میں اس آیت سے زمین کی زکوٰۃ یعنی عشر مراد ہو سکتا ہے، کیونکہ ان کے نزدیک وجوب زکوٰۃ کا اصل حکم مکہ میں نازل ہو چکا تھا، سورۂ مزمل کی آیت زکوٰۃ کے حکم پر مشتمل ہے، جو باتفاق مکی ہے، البتہ مقادیر زکوٰۃ اور نصاب

کا تعین وغیرہ ہجرت کے بعد ہوا، اور اس آیت سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ زمین کی پیداوار پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی حق عائد کیا گیا ہے، اس کی مقدار کی تعیین اس میں مذکور نہیں، اس لئے بحق مقدار یہ آیت مجمل ہے، اور مکہ معظمہ میں اس تعیین مقدار کی یہاں ضرورت بھی اس لئے نہ تھی کہ وہاں مسلمانوں کو یہ اطمینان حاصل نہ تھا کہ زمینوں اور باغوں کی پیداوار سہولت کے ساتھ حاصل کر سکیں، اس لئے اس زمانہ میں تو رواج وہی رہا جو پہلے سے نیک لوگوں میں چلا آتا تھا، کہ کھیتی کاٹنے یا پھل توڑنے کے وقت جو غریب غربا، وہاں جمع ہو جاتے ان کو کچھ دیدیتے تھے، کوئی خاص مقدار معین نہ تھی، اسلام سے پہلے دوسری امتوں میں بھی کھیتی اور پھلوں میں اس طرح کا صدقہ دینے کا رواج قرآن کریم کی آیت اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ میں مذکور ہے، ہجرت کے دو سال بعد جس طرح دوسرے اموال کے نصاب اور مقدار زکوٰۃ کی تفصیلات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بوحی الٰہی بیان فرمائی، اسی طرح زمین کی زکوٰۃ کا بیان فرمایا، جو حضرت معاذ بن جبل اور ابن عمر اور جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم کی روایت سے تمام کتب حدیث میں منقول ہے مَاسَقَتِ السَّمَآءُ فَفِيْهِ الْعُشْرُ وَمَا سُقِيَ بِالسَّانِيَةِ فَنِصْفُ الْعُشْرِ، یعنی بارانی زمینوں میں جہاں آبپاشی کا کوئی سامان نہیں صرف بارش پر پیداوار کا مدار ہے، ان زمینوں کی پیداوار کا دسواں حصہ بطور زکوٰۃ نکالنا واجب ہے، اور جو زمینیں کنوؤں سے سیراب کی جاتی ہیں اُن کی پیداوار کا بیسواں حصہ واجب ہے۔

قانونِ زکوٰۃ میں شریعتِ اسلام نے ہر قسم کی زکوٰۃ میں اس بات کو بنیادی اصول کے طور پر استعمال کیا ہے، کہ جس پیداوار میں محنت اور خرچ کم ہے اس میں زکوٰۃ کی مقدار زیادہ اور جتنی محنت اور خرچ کسی پیداوار پر بڑھتا جاتا ہے اتنی ہی زکوٰۃ کی مقدار کم ہوتی جاتی ہے، مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ اگر کسی کو کوئی قدیم خزانہ مل جائے، یا سونے چاندی وغیرہ کی کان نکل آئے تو اس کا پانچواں حصہ بطور زکوٰۃ کے اس کے ذمہ لازم ہے، کیونکہ محنت اور خرچ کم اور پیداوار زیادہ ہے، اس کے بعد بارانی زمین کا نمبر ہے، جس میں محنت اور خرچ کم سے کم ہے اس کی زکوٰۃ پانچویں حصہ سے آدھی یعنی دسواں حصہ کر دیا گیا، اس کے بعد وہ زمین ہے جس کو کنویں سے یا نہری پانی خرید کر اس سے سیراب کیا جاتا ہے، اس میں محنت اور خرچ بڑھ گیا تو زکوٰۃ اس سے بھی آدھی کر دی گئی یعنی بیسواں حصہ، اس کے بعد عام نقد سونا یا چاندی اور مال تجارت ہے، جن کے حاصل کرنے اور بڑھانے پر خرچ بھی کافی ہوتا ہے اور محنت بھی زیادہ، اس لئے اس کی زکوٰۃ اس کی آدھی یعنی چالیسواں حصہ کر دیا گیا۔

قرآن کی آیت مذکورہ میں اور حدیث کی روایت مذکورہ میں زمین کی پیداوار کے لئے کوئی

نصاب مقرر نہیں فرمایا، اسی لئے امام اعظم ابوحنیفہؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کا مذہب یہ ہے کہ زمین کی پیداوار خواہ تھوڑی ہو یا زیادہ، بہرحال اس کی زکوٰۃ نکالنا ضروری ہے، قرآن کی آیت سورۂ بقرہ جس میں زمین کی زکوٰۃ کا ذکر ہے وہاں بھی اس کے لئے کوئی نصاب مذکور نہیں، ارشاد ہے:

اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ	"یعنی خرچ کرو اپنی حلال کمائی میں سے اور اس چیز میں سے جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے نکالی ہے"

تجارتی اموال اور مویشی کے لئے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نصاب بیان فرما دیا، کہ ساڑھے باون تولہ چاندی سے کم میں زکوٰۃ نہیں چالیس بکریوں یا پانچ اونٹوں سے کم میں زکوٰۃ نہیں، لیکن پیداوار زمین کے متعلق جو بیان اوپر کی حدیث میں آیا ہے اس میں کوئی نصاب نہیں بتلایا گیا، اس لئے ہر قلیل و کثیر میں سے زمین کی زکوٰۃ یعنی دسواں یا بیسواں حصہ نکالنا واجب ہے۔

آخر آیت میں فرمایا وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ، یعنی حد سے زائد خرچ نہ کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ فضول خرچ لوگوں کو پسند نہیں کرتے، یہاں سوال یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں اگر کوئی شخص اپنا سارا مال بلکہ جان بھی خرچ کر دے تو اس کو اسراف نہیں کہا جا سکتا، بلکہ حق کی ادائیگی کہنا بھی مشکل ہے، پھر اس جگہ اسراف سے منع کرنے کا کیا مطلب ہے؟ جواب یہ ہے کہ کسی خاص شعبہ میں اسراف کا نتیجہ عادۃً دوسرے شعبوں میں قصور و کوتاہی ہوا کرتا ہے، جو شخص اپنی خواہشات میں بے دریغ حد سے زائد خرچ کرتا ہے وہ عموماً دوسروں کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی کیا کرتا ہے، یہاں اسی کوتاہی سے روکا گیا ہے، یعنی ایک طرف کوئی آدمی اپنا سارا مال اللہ کی راہ میں لٹا کر خالی ہو بیٹھے تو اہل و اولاد اور رشتہ داروں بلکہ خود اپنے نفس کے حقوق کیسے ادا کریگا، اس لئے ہدایت یہ کی گئی کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے میں بھی اعتدال سے کام لے تاکہ سب حقوق ادا ہو سکیں۔

ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ۭ

پیدا کئے آٹھ نر اور مادہ بھیڑ میں سے دو اور بکری میں سے دو

قُلْ ءٰۗالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ

پوچھ تو کہ دونوں نر حرام کئے ہیں یا دونوں مادہ یا وہ بچہ کہ اس پر مشتمل

عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ۭ نَبِّـــُٔوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۱۴۳

ہیں بچہ دان دونوں مادہ کے بتلاؤ مجھ کو سند اگر تم سچے ہو،

وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ۭ قُلْ ءٰۗالذَّكَرَيْنِ
اور پیدا کئے اونٹ میں سے دو اور گائے میں سے دو پوچھ تو دونوں نر حرام کئے
حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ۭ
ہیں یا دونوں مادہ یا وہ بچہ کہ اس پر مشتمل ہیں بچہ دان دونوں مادہ کے
اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاۗءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ
کیا تم حاضر تھے جس وقت تم کو اللہ نے یہ حکم دیا تھا پھر اس سے زیادہ ظالم کون
مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَي اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ اِنَّ
جو بہتان باندھے اللہ پر جھوٹا تاکہ لوگوں کو گمراہ کرے بلا تحقیق بیشک
اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۴﴾
اللہ ہدایت نہیں کرتا ظالم لوگوں کو

ع ۱۷ ۴

خلاصہ تفسیر

(اور یہ مواشی جن میں تحلیل و تحریم کرتے ہو) آٹھ نر و مادہ (پیدا کئے) یعنی بھیڑ (اور دنبہ) میں دو قسم (ایک نر اور ایک مادہ) اور بکری میں دو قسم (ایک نر اور ایک مادہ) آپ (ان سے) کہئے کہ (یہ تو بتلاؤ کہ) کیا اللہ تعالیٰ نے ان (دونوں جانور کے) دونوں نروں کو حرام کہا ہے یا دونوں مادہ کو (حرام کہا ہے) یا اس (بچہ) کو جس کو دونوں مادہ (اپنے) پیٹ میں لئے ہوئے ہوں (وہ بچہ نر ہو یا مادہ یعنی تم جو مختلف صورتوں سے تحریم کے مدعی ہو تو کیا تحریم اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے) تم مجھ کو کسی دلیل سے تو بتلاؤ اگر (اپنے دعوے میں) سچے ہو (یہ تو چھوٹے قد والے کے متعلق بیان ہوا آگے بڑے قد والوں کا بیان ہے کہ بھیڑ بکری میں بھی نر و مادہ پیدا کیا، جیسا بیان ہوا) اور (اسی طرح) اونٹ میں دو قسم (ایک نر اور ایک مادہ) اور گائے (اور بھینس) میں دو قسم (ایک نر اور ایک مادہ پیدا کئے) آپ (ان سے اس باب میں بھی) کہئے کہ (یہ تو بتلاؤ کہ) کیا اللہ تعالیٰ نے ان دونوں (جانور کے) نروں کو حرام کہا ہے یا دونوں مادہ کو (حرام کہا ہے) یا اس (بچہ) کو جس کو دونوں مادہ (اپنے) پیٹ میں لئے ہوئے ہوں (وہ بچہ نر ہو یا مادہ، اس کا بھی وہی مطلب ہے کہ تم جو مختلف صورتوں سے تحریم کے مدعی ہو تو کیا یہ تحریم اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے) اس پر کوئی دلیل قائم کرنا چاہیے، جس کے دو طریقے ہیں، ایک تو یہ کہ کسی رسول و فرشتہ کے واسطے سے ہو، سو مسئلہ نبوت و وحی سے تو تم کو انکار ہی ہے، اس شق کو تو اختیار کر نہیں سکتے، پس دوسرا

طریق دعویٰ کرنے کے لئے متعین ہو گیا کہ خود خدا تعالیٰ نے بلا واسطہ تم کو یہ احکام دیئے ہوں تو کیا تم (اس وقت) حاضر تھے جس وقت اللہ تعالیٰ نے تم کو اس (تحریم و تحلیل) کا حکم دیا اور ظاہر ہے کہ اس کا دعویٰ بھی نہیں ہو سکتا، پس ثابت ہو گیا کہ ان کے پاس کوئی دلیل نہیں) تو (بعد ثبوت اس امر کے کہ اس دعوے پر کوئی دلیل نہیں یقینی بات ہے کہ) اس سے زیادہ کون ظالم (اور کاذب) ہو گا جو اللہ تعالیٰ پر بلا دلیل (تحلیل و تحریم کے باب میں) جھوٹ تہمت لگائے تاکہ لوگوں کو گمراہ کرے (یعنی یہ شخص بڑا ظالم ہو گا اور) یقیناً اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو (جنت کا) رستہ (آخرت میں) نہ دکھلاویں گے (بلکہ دوزخ میں بھیجیں گے، پس یہ لوگ بھی اس جرم کی سزا میں دوزخ میں جاویں گے)۔

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰي طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ
تو کہہ دے کہ میں نہیں پاتا اس وحی میں کہ مجھ کو پہنچی ہو کسی چیز کو حرام کھانے والے پر جو اس کو کھاوے،
اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ
مگر یہ کہ وہ چیز مردار ہو یا بہتا ہوا خون یا گوشت سؤر کا کہ وہ
رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ
ناپاک ہے یا ناجائز ذبیحہ جس پر نام پکارا جاوے اللہ کے سوا کسی اور کا، پھر جو کوئی بھوک سے بے اختیار
وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۵﴾ وَعَلَي الَّذِيْنَ هَادُوْا
ہو جاوے نہ نافرمانی کرے اور زیادتی کرے تو تیرا رب بڑا معاف کرنے والا ہے مہربان اور یہود پر ہم نے حرام کیا
حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ
تھا ہر ایک ناخن والا جانور اور گائے اور بکری میں سے حرام کی تھی
شُحُوْمَهُمَا اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا
ان کی چربی مگر جو لگی ہو پشت پر یا انتڑیوں پر یا جو چربی کہ ملی ہوئی ہو
اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۭ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۡ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۱۴۶﴾
ہڈی کے ساتھ یہ ہم نے ان کو سزا دی تھی ان کی شرارت پر اور ہم سچ کہتے ہیں
فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ
پھر اگر تجھ کو جھٹلاویں تو کہہ دے کہ تمہارے رب کی رحمت میں بڑی وسعت ہے اور نہیں ٹلے گا
عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۴۷﴾
اس کا عذاب گنہگار لوگوں سے،

خلاصۂ تفسیر

آپ کہہ دیجئے کہ (جن حیوانات میں کلام ہو رہا ہے ان کے متعلق) جو کچھ احکام بذریعہ وحی میرے پاس آئے ہیں اُن میں تو میں کوئی حرام غذا پاتا نہیں کسی کھانے والے کے لئے جو اس کو کھاوے (خواہ مرد ہو یا عورت) مگر (ان چیزوں کو البتہ حرام پاتا ہوں وہ) یہ کہ وہ مردار (جانور) ہو (یعنی جو باوجود واجب الذبح ہونے کے بلا ذبح شرعی مرجاوے) یا یہ کہ بہتا ہوا خون ہو یا خنزیر کا گوشت ہو کیونکہ وہ (خنزیر) بالکل ناپاک ہے (اسی لئے اس کے سب اجزاء نجس اور حرام ہیں ایسا نجس نجس العین کہلاتا ہے) یا جو (جانور وغیرہ) شرک کا ذریعہ ہو (اس طرح) کہ (بقصد تقرب) غیر اللہ کے نامزد کر دیا گیا ہو (سو یہ سب حرام ہیں) پھر (بھی اس میں اتنی آسانی رکھی ہے کہ) جو شخص (بھوک سے بہت ہی) بیتاب ہو جاوے بشرطیکہ نہ تو (کھانے میں) طالب لذت ہو اور نہ (قدر ضرورت وحاجت سے) تجاوز کرنے والا ہو تو (اس حالت میں ان حرام چیزوں سے کھانے میں بھی اس شخص کو کچھ گناہ نہیں ہوتا) واقعی آپ کا رب (اس شخص کے لئے) غفور رحیم ہے (کہ ایسے وقت میں رحمت فرمائی کہ گناہ کی چیز میں گناہ اٹھا دیا) اور یہود پر ہم نے تمام ناخن والے جانور حرام کر دیئے تھے اور گائے اور بکری (کے اجزاء میں سے) ان دونوں کی چربیاں ان (یہود) پر ہم نے حرام کر دی تھیں مگر وہ (چربی مستثنیٰ تھی) جو ان (دونوں) کی پشت پر یا انتڑیوں میں لگی ہو یا جو (چربی) ہڈی سے ملی ہوئی ہو (باقی سب چربی حرام تھی، سو ان چیزوں کی تحریم فی نفسہٖ مقصود نہ تھی بلکہ) ان کی شرارت کے سبب ہم نے ان کو یہ سزا دی تھی اور ہم یقیناً سچے ہیں، پھر (اس تحقیق مذکور کے بعد بھی) اگر یہ (مشرکین) آپ کو (نعوذ باللہ اس مضمون میں صرف اس وجہ سے) کاذب کہیں (کہ ان پر عذاب نہیں آتا) تو آپ (جواب میں) فرما دیجئے کہ تمہارا رب بڑی وسیع رحمت والا ہے، (بعض حکمتوں سے جلدی مواخذہ نہیں فرماتا) اور (اس سے یوں نہ سمجھو کہ ہمیشہ یوں ہی بچے رہیں گے جب وہ وقت معین آجاویگا پھر اس وقت) اس کا عذاب مجرم لوگوں سے (کسی طرح) نہ ٹلے گا۔

سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا

اب کہیں گے مشرک اگر اللہ چاہتا تو شرک نہ کرتے ہم اور نہ ہمارے باپ دادے

وَلَا حَرَّمْنَا مِن شَيْءٍ ۚ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ

اور نہ ہم حرام کر لیتے کوئی چیز اسی طرح جھٹلا گئے ان سے اگلے

حَتَّىٰ ذَاقُوا بَأْسَنَا ۗ قُلْ هَلْ عِندَكُم مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا ۖ

یہاں تک کہ انھوں نے چکھا ہمارا عذاب، تو کہہ کچھ علم بھی ہے تمہارے پاس کہ اس کو ہمارے آگے ظاہر کرو

إِن تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ ﴿١٤٨﴾ قُلْ

تم تو نری اٹکل پر چلتے ہو اور صرف تخمینے ہی کرتے ہو، تو کہہ دے

فَلِلَّهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۖ فَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿١٤٩﴾ قُلْ

پس اللہ کا الزام پورا ہے سو اگر وہ چاہتا تو ہدایت کر دیتا تم سب کو، تو کہہ کہ

هَلُمَّ شُهَدَاءَكُمُ الَّذِينَ يَشْهَدُونَ أَنَّ اللَّهَ حَرَّمَ هَٰذَا ۖ

لاؤ اپنے گواہ جو گواہی دیں اس بات کی کہ اللہ نے حرام کیا ہے ان چیزوں کو،

فَإِن شَهِدُوا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ

پھر اگر وہ ایسی گواہی دیں تو بھی تو اعتبار نہ کر ان کا اور نہ چل اُن کی خوشی پر جنھوں نے

كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ وَهُم

جھٹلایا ہمارے حکموں کو اور جو یقین نہیں کرتے آخرت کا اور وہ اپنے

۱۸ ع ۵ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُونَ ﴿١٥٠﴾

رب کے برابر کرتے ہیں اوروں کو

خلاصۂ تفسیر

یہ مشرکین یوں کہنے کو ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کو (بطور رضا کے یہ امر) منظور ہوتا (کہ ہم شرک اور تحریم نہ کریں، یعنی اللہ تعالیٰ عدم شرک وعدم تحریم کو پسند کرتے اور شرک و تحریم کو ناپسند کرتے) تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا (شرک کرتے) اور نہ ہم (اور نہ ہمارے بزرگ) کسی چیز کو (جن کا ذکر اوپر آچکا ہے) حرام کہہ سکتے (اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اس شرک و تحریم سے ناراض نہیں، اللہ تعالیٰ جواب دیتے ہیں کہ یہ استدلال اس لئے باطل ہے کہ مستلزم تکذیب رسل کو ہے، پس یہ لوگ رسول کی تکذیب کر رہے ہیں، اور جس طرح یہ کر رہے ہیں) اسی طرح جو (کافر) لوگ ان سے پہلے ہو چکے ہیں انھوں نے بھی (رسولوں کی) تکذیب کی تھی، یہاں تک کہ انھوں نے ہمارے عذاب کا مزہ چکھا (خواہ دنیا میں، جیسا اکثر کفار سابقین پر نزول عذاب ہوا، خواہ مرنے کے بعد تو ظاہر ہی ہے، اور یہ اشارہ ہے اس طرف کہ ان لوگوں کے کفریات کے مقابلہ